ماہنامہ
طلوعِ اسلام
جون 2025ء
لاہور
اشاعت کا اکیاسی واں سال

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ (الحدیث)

حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ
کی خواہش پر 1938ء سے شائع
ہونے والا ماہنامہ

نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں، تُو باقی نہیں ہے
(علامہ اقبالؒ)

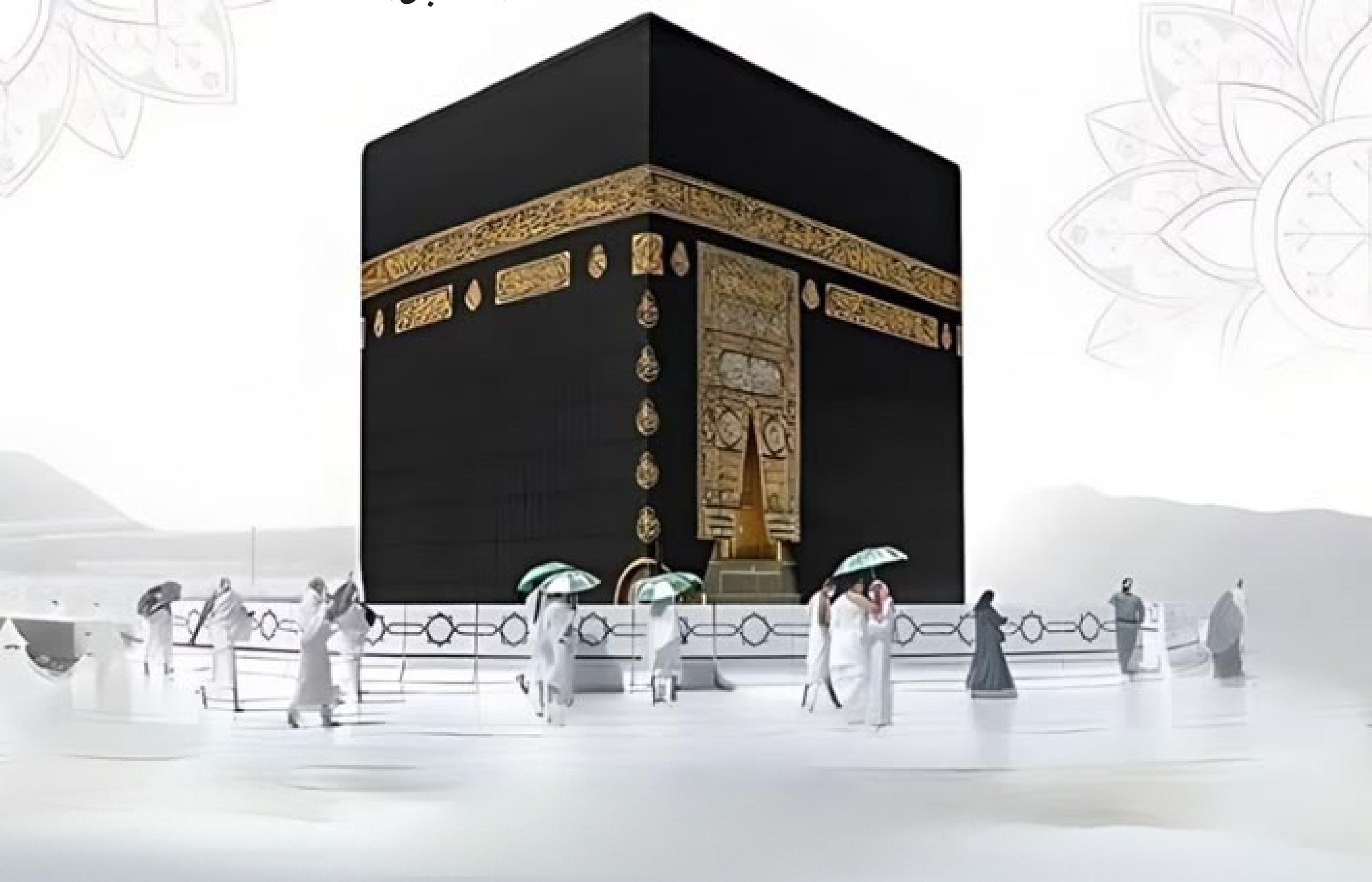

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مذہب اور دینِ اسلام کا تقابلی جائزہ

یورپ نے غالباً مانی کے عقیدے سے روح کو مادہ کی ثنویت کا خیال اخذ کیا اور بلاتنقید اسے قبول کر لیا۔ اسی نظریہ کی بنیاد پر انہوں نے مذہب (Religion) اور سیاست (State) کی ثنویت کا تصور پیش کیا۔ قرآنِ کریم میں مذہب کا لفظ ہی کہیں نہیں آیا۔ اس لئے اسلام کو مذہب نہیں بلکہ قرآن کے دیئے ہوئے دین کے نام سے پکارنا چاہئے۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (3:19)۔

مذہب	دینِ اسلام
1- مذہب، خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق اور داخلی تجربہ کا نام ہے۔	دین اجتماعی نظامِ زندگی اور خارجی حقیقت ہے۔
2- مذہب میں ہر فرد اپنے طور پر مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس کا خدا کے ساتھ رشتہ قائم ہو گیا ہے۔	دین میں معاشرہ کا انداز اور آئین بتا سکتے ہیں کہ وہ قوانین خداوندی کے مطابق متشکل ہوا ہے یا نہیں۔
3- مذہب میں ہر فرد کا منتہیٰ اپنی اپنی نجات ہوتا ہے۔	دین کا مقصود عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود ہوتا ہے۔
4- مذہب میں کوئی خارجی معیار ایسا نہیں ہوتا جس سے پرکھا جا سکے کہ انسان کے اعمال صحیح نتائج پیدا کر رہے ہیں یا نہیں۔	دین میں اجتماعی زندگی کے نتائج ساتھ کے ساتھ بتاتے چلے جاتے ہیں کہ ملت صحیح راستے پر چل رہی ہے یا نہیں۔
5- مذہب انسان کو مختلف فرقوں میں تقسیم کر دیتا ہے اور اس میں ہر فرقہ اپنے آپ کو حق پر سمجھ کر خوش ہوتا ہے۔	دین میں تفرقہ کو شرک کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ پوری نوعِ انسانی سے مخاطب اور اس کا رب، رب العالمین اور رسول رحمۃ للعالمین کا مقام رکھتے ہیں۔
6- مذہب عوام کے جذبات کے پیچھے چلتا ہے اور ان کی تسکین کا سامان فراہم کئے چلا جاتا ہے۔ اس لئے اس کی تعلیم یہ ہے۔ زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز	دین، انہیں حقائق کے پیچھے چلاتا ہے اور ان کے سطحی جذبات کی تسکین کی بجائے ان پر قابو پانے کی تعلیم یوں دیتا ہے۔ زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز
7- مذہب انسان کے دل میں ہر وقت خوف پیدا کرتا رہتا ہے اور اپنی ہر بات ڈر سے منواتا ہے۔	دین خوف کو شرک قرار دیتا ہے اور انسان کے دل کو جرأت اور بے باکی کا مسکن بناتا ہے۔

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور
جون 2025ء

جلد 78 | شمارہ نمبر 06

چیئرمین: خورشید انور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر اعجاز رسول
اقبال ادریس ایڈووکیٹ

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِتعاون: 50روپے فی پرچہ
پاکستان: 600روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 1000روپے سالانہ

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: حقائق کی طرف واپسی —— تاریخ کی گواہی	ادارہ	4
ہندو کا علاج ہی یہی ہے	ادارہ	5
جہاد	ادارہ	12
درسِ قرآن (سورۃ الذٰریٰت آیات 24 تا 46)	علامہ غلام احمد پرویز علیہ الرحمۃ	26
پرویز صاحب کا نظریۂ قرآنِ کریم	منظور حسین لیل، بھکر	41
کیا موجودہ پاکستان تعبیرِ خوابِ علامہ اقبالؒ ہے؟	محمد حنیف، سیالکوٹ	61

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ2، لاہور54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546
Cell: +92 310-4800818
Cell: +92 318 2221851
idarati@gmail.com
www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672

For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ناشر: عرفان راٹھور اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگII لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کرسکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا!
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیّت ہے
حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

چہ باید مرد را طبع بلندے، مشربِ نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

(بانگِ درا۔علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

حقائق کی طرف واپسی ——— تاریخ کی گواہی

حالیہ دنوں چیف آف آرمی اسٹاف نے ایک تقریر میں نہایت وضاحت سے دوقومی نظریہ، علامہ اقبال کے افکار، اور اس نظریۂ پاکستان کی بنیادوں کا حوالہ دیا جو برصغیر کے مسلمانوں کی سیاسی وتہذیبی شناخت کا ضامن ہے۔ یہ نہ صرف حالات کی سنگینی کا ادراک ہے بلکہ ایک تاریخی حقیقت کی طرف واپسی کی علامت بھی ہے ــــ وہی حقیقت جسے طلوعِ اسلام برسوں سے بے خوفی سے بیان کرتا چلا آرہا ہے۔

دوقومی نظریہ محض ایک سیاسی نعرہ نہ تھا، بلکہ ایک فکری وتہذیبی بنیاد تھی جسے علامہ اقبال نے اپنے خطبات، اشعار، اور خطوط میں واضح کیا، اور جس کی ترویج وتفہیم میں علامہ غلام احمد پرویز رحمہ اللہ نے غیر معمولی خدمات انجام دیں۔ ادارہ ''طلوعِ اسلام'' اسی نظریے کو فکری بنیاد فراہم کرتا رہا ہے ــــ کہ مسلمان ایک جداگانہ تہذیب، اقدار، اور قرآنی نظریۂ حیات کے حامل ہیں۔

علامہ پرویز نے تحریک پاکستان کے دوران ماہنامہ ''طلوعِ اسلام'' کے ذریعے برصغیر کے مسلمانوں کو اس فکری نہج پر قائم رہنے کی دعوت دی، جو اقبال کے خواب اور قائداعظم کی جدوجہد کا جوہر تھا۔ انہوں نے برملا کہا کہ پاکستان کا مقصد صرف جغرافیہ نہیں بلکہ قرآنی نظام ربوبیت وعدل وحریت کا قیام ہے ــــ وہ نظام جو نہ طبقاتی ہو، نہ استحصالی، بلکہ ہر انسان کے بنیادی حقوق کا محافظ ہو۔

بدقسمتی سے قیام پاکستان کے بعد اس نظریے کو عملی جامہ پہنانے کی بجائے فرسودہ روایتی مذہب، فرقہ پرستی اور مفاد پرستانہ سیاست کو فروغ دیا گیا۔ طلوعِ اسلام نے انحراف کی ان روشوں پر نہ صرف تنقید کی بلکہ ہر دور میں قرآن کے اصولی موقف کو واضح کیا۔

آج جب ہندوستان کی جانب سے جارحیت، انتہا پسندی اور پاکستان دشمن عزائم کھل کر سامنے آچکے ہیں، تو یہ امر ایک بار پھر نمایاں ہو رہا ہے کہ تحریک پاکستان کے دوران ہندو قیادت کی نیت پر جس طرح بابا جی نے خبردار کیا تھا، وہ آج کے حالات میں حرف بہ حرف سچ ثابت ہو رہا ہے۔

طلوعِ اسلام نے ہمیشہ باور کرایا ہے کہ بھارت کا مسئلہ سرحد یا تجارت کا نہیں بلکہ تہذیب، نظریہ اور فکر کا ہے۔ اسی لئے علامہ پرویز صاحب نے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا، اور قیام پاکستان کے بعد عمر بھر قرآنی نظام کے قیام کی جدوجہد کرتے رہے۔ آج وقت خود یہ گواہی دے رہا ہے کہ جس موقف کو ایک وقت ''غیر روایتی''، ''غیر مقبول''، یا ''تنہا آواز'' سمجھا گیا، وہی موقف آج عوامی اور ریاستی اداروں کی سوچ میں داخل ہو رہا ہے ــــ گویا سچائی کی طرف واپسی کا آغاز ہو چکا ہے۔

طلوعِ اسلام اس لمحے کو پاکستان کے فکری احیاء کا ابتدائی موڑ سمجھتا ہے، اور توقع رکھتا ہے کہ اب یہ سفر قرآنی نظام کے نفاذ کی طرف بڑھے گا ــــ وہی نظام جس کے قیام کے لئے یہ ملک حاصل کیا گیا تھا۔

ادارہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ہندو کا علاج یہی ہے

یہ لمعات جولائی 1948ء میں لکھے گئے تھے۔ آپ انہیں دیکھیئے اور اس کے بعد ان اقدامات کو سامنے لایئے جو ہندوؤں کی طرف سے اس عرصہ میں پاکستان کی سالمیت (بلکہ جداگانہ تشخص) کو ختم کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً عمل میں آتے رہے ہیں۔ آپ یقیناً اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ہندو ذہنیت ایک نو دولتئے رئیس زادہ یا ایک بگڑے ہوئے بچہ کی سی ہے جس کی تخریبی کارروائیوں سے محفوظ رہنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اسے شترِ بے مہار کی طرح بدلگام نہ ہونے دیا جائے بلکہ اس کے راستے میں رکاوٹ ڈالی جائے۔ اور یہ رکاوٹ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کی دراز دستیوں کا مقابلہ قوت سے کیا جائے۔ پاکستان نے اسے مہلت کا عرصہ بہت لمبا دیا اور بالآخر ہمیں وہ کچھ کرنا پڑا جس کا مستحق ہندو بہت پہلے سے ہو چکا تھا۔ ہم حکومتِ پاکستان کو اس بر وقت فیصلہ پر درخور مبارکباد سمجھتے ہیں۔ اس فیصلہ کو عملی پیکر عطا کرنے کے لئے ہماری فوج نے جس شجاعت، جرأت، ثبات و استقامت کا مظاہرہ کیا، ہم اس کے لئے ان کی خدمت میں بھی ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔ نیز ہماری شہری آبادی نے ایسے نازک وقت میں جس صبر و سکون، بلند حوصلگی اور جمعیتِ خاطر کا ثبوت دیا ہے وہ ہمارے لئے باعثِ صد فخر و مباہات ہے۔

> اگر آپ کا ایک بھائی جیل خانہ میں ہے تو کیا اس کی مشکلات کا مداوا اس سے ہوتا ہے کہ آپ بھی اس کے ساتھ جیل خانے کی کوٹھڑی میں بند ہو جائیں۔ حل اس کا کچھ اور ہوتا ہے۔

اپنے گھر کی حفاظت فریضۂ انسانیت ہے۔ لیکن پاکستان تو ہمارے لئے گھر سے بھی زیادہ گراں بہا متاع ہے۔ یہ ذریعہ ہے اس نظامِ خداوندی کے قیام کا جس میں نہ صرف ہماری بلکہ عالمگیر انسانیت کی صحیح فلاح و بہبود کا راز پوشیدہ ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے پاکستان کی حفاظت ہمارا انسانی فریضہ ہی نہیں بلکہ ایمان کا تقاضہ ہے۔ بنا بریں ہم اہل پاکستان سے گزارش کریں گے کہ اس خطۂ زمین کی حفاظت اور سالمیت کے لئے اگر انہیں کسی دشواری مشکل یا تکلیف یا خطرہ تک کا سامنا کرنا پڑے تو اسے خندہ پیشانی سے برداشت کریں اور اس ضمن میں کسی قسم کی گھبراہٹ تشویش یا پریشانی کو قریب تک نہ آنے دیں۔

اس سلسلے میں ہم ملک کے اربابِ حل وعقد سے بھی گزارش کریں گے کہ وہ ملک کے دفاع کے لئے جس حسنِ تدبر کا ثبوت دے رہے ہیں اس کے ساتھ ہی وہ بتدریج ایسے اقدامات بھی کرتے جائیں جن سے اہل ملک کا یہ خیال یقین میں بدلتا جائے کہ ہمارا ہر قدم اس منزل کی طرف اٹھ رہا ہے جو حصول پاکستان کے لئے ہمارا منتہائے مقصود تھا۔ یعنی ملک میں قرآنی نظام کی عملی تشکیل۔ پھر دیکھیئے کہ یہی پیکرانِ آب و گل، مخالفت کے ہر خس و خاشاک پر کس طرح برقِ خاطف بن کر گرتے ہیں۔ اس لئے کہ

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ رُوح الامیں پیدا

اور

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملّت یہی قوّت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملّت ہے

ہندوؤں نے سومنات کی جامع مسجد کو جسے 1024ء میں محمود غزنوی نے تعمیر کرایا تھا زبردستی مندر میں تبدیل کر لیا اس موقعہ پر ہندوؤں نے بہت بڑا جشن منایا جس میں پولیس اور فوج نے بھی شرکت کی مسجد۔ کے 75 سالہ بوڑھے متولی کو باہر نکال دیا گیا اور خدا کے اس گھر میں بُت رکھ دیے گئے۔ اب مسجد میں ناقوس بجتا ہے اور بتوں کی پوجا ہوتی ہے۔ (ڈان، 12 جون 1948ء)

یہ ایک مثال ہے استبداد اور قہرمانیت کی ان سینکڑوں مثالوں میں سے جو ہندوستان کی مزعومہ جمہوری حکومت با ایں ہمہ ادعائے حریتِ فکر و نظر اور آزادی مذہب و مسلک، ہندوستان کے چار کروڑ مسلمانوں پر بلا دریغ و بے محابا روا رکھ رہی ہے۔ ایک مساجد و معابد کا ذکر کیا کونسی شے ہے جو مسلمانوں کے نزدیک محبوب و محترم ہے اور اسے وہاں محفوظ و مصئون سمجھا جا سکتا ہے، جان، مال، عزت، آبر، عصمت، ناموس سب ان کے رحم و کرم پر ہے جنہیں۔

خبر نہیں روشِ بندہ پروری کیا ہے

یہی وہ فسادِ ملوکیت ہے جس کی طرف قرآنِ کریم نے ان بلیغ الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے کہ: اِنَّ الۡمُلُوۡکَ اِذَا دَخَلُوۡا قَرۡیَۃً اَفۡسَدُوۡہَا وَ جَعَلُوۡۤا اَعِزَّۃَ اَہۡلِہَاۤ اَذِلَّۃً ۚ وَ کَذٰلِکَ یَفۡعَلُوۡنَ ﴿۳۴﴾ (27:34) جب کسی ایسی قوم کو حکومت مل جاتی ہے جو نشۂ ملوکیت سے بدمست ہو تو وہ عدل و انصاف کی تمام راہوں کو الٹ دیتی ہے اور عزت و شرافت کے پیکروں کو ذلیل و خوار کرنے میں لذت لیتی ہے۔ وَ کَذٰلِکَ یَفۡعَلُوۡنَ ﴿۳۴﴾ یعنی یہ کسی ہنگامی واقعہ کی طرف اشارہ نہیں جو زمنہ قدیم میں کبھی گزر چکا ہو۔ بلکہ یہ خاصۂ ملوکیت ہے، یہ قوتِ بے زمام کی فطرت ہے۔ ملوکیت ہمیشہ یہی کرتی چلی آ رہی ہے۔ اور یہی کرتی چلی جائے گی۔ وَ کَذٰلِکَ یَفۡعَلُوۡنَ ﴿۳۴﴾ اور جب حکومت و سطوت کسی ایسی قوم کو مل جائے جو ہمیشہ غلام رہی ہو تو ان کی کم ظرفی اور تنگ نگہی جور و استبداد کے خنجر عریاں کے ساتھ بدفطرتی اور سفلگی کی جراحتِ پنہاں بھی شامل کر دیتی ہے اور ان کی ہوسِ خون آشامی اور انتقام جوئی سسک سسک کر مرنے والوں کا تماشہ دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ مصیبتِ عظمیٰ اور نائبہ کبریٰ جس میں آج ہندوستان کا مسلمان گرفتار ہے۔

وہ مسلمان جو تقسیمِ ہند کی مخالفت کیا کرتے تھے اس چیز کو اپنے مسلک کے حق بجانب ہونے کے لئے بطور دلیل پیش کرتے ہیں اور خوش ہیں کہ انہیں یہ دلیل مل گئی۔ بعض سادہ لوح مسلمان ان کی اس نگہ فریب دلیل سے متاثر بھی ہو جاتے ہیں اور کہنے لگتے ہیں کہ تقسیمِ ہند (یا تشکیلِ پاکستان) فی الواقعہ ایک غلط قدم تھا۔ لیکن سوچئے کہ کیا حقیقت یہی ہے!

تقسیمِ ہند سے پہلے جن جن امور میں ہندوؤں کو دستِ غالب حاصل تھا۔ ذرا غور کیجئے کہ ان میں مسلمانوں کے ساتھ کیا گزرا کرتی تھی۔ ملازمت، تجارت، صنعت و حرفت یا اس سے آگے بڑھئے تو بلدیہ یا ڈسٹرکٹ بورڈ۔ اور آگے بڑھئے تو ہندو فرماں رواؤں کی ریاستیں۔ ذرا سوچئے کہ ان تمام شعبوں اور دائروں میں مسلمانوں کا کس قدر حصہ ہوا کرتا تھا اور ابھی وہاں

انگریز کا راج تھا۔ یہ غلط ہے کہ تقسیمِ ہند کے بعد چونکہ وہاں مسلمانوں کی تعداد نسبتاً کم رہ روگئی ہے اس لئے ہندو دلیر ہو گیا ہے۔ تعداد کا سوال ہی نہیں۔ کیا نو دس کروڑ اور کیا چار پانچ کروڑ۔ یہ ہر حال اقلیت میں تھے اصل چیز ہندو کی ذہنیت ہے، انگریز کے راج میں وہ دبے پاؤں چلا کرتی تھی اب کھلے بندوں سامنے آرہی ہے۔ اگر مسلمان دس کروڑ بھی ہوتے تو بھی ہندو کی خوئے مخاصمت و معاندت میں کوئی فرق نہ آتا۔ آج بھی دیکھئے مثلاً۔ یوپی بہار، ممبئی وغیرہ میں قریب قریب اتنے ہی مسلمان ہیں جتنے تقسیمِ ہند سے پہلے تھے۔ لیکن ان کی یہ تعداد ہندوؤں کی چیرہ دستیوں اور ستم کوشیوں پر ذرا بھی اثر انداز نہیں ہو رہی۔ اس لئے یہ کہنا سرتا سرا بلہ فریبی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں پر جو کچھ بیت رہی ہے اس کی ذمہ دار تقسیمِ ہند ہے۔

> پاکستان تمام ملتِ اسلامیہ کی مشترکہ امانت ہے۔ ہمارے اکابر و اعیان اس امانت کے واحد مالک نہیں کہ اس کے ضائع ہونے میں صرف انہیں کا نقصان ہوگا۔ ہمارا کچھ نہ بگڑے گا۔ یہ تو وہ آگ ہوگی جس کے شعلوں سے نہ خواص ہی بچ سکیں کے نہ عوام۔

اب دوسری طرف آیئے۔ اگر ہندوستان کی تقسیم نہ ہوتی تو دس کروڑ مسلمانوں پر وہی کچھ ہوتا جو آج وہاں چار کروڑ مسلمانوں پر ہو رہا ہے۔ اس تقسیم سے کم از کم پانچ چھ کروڑ مسلمان تو ان کی دراز دستیوں اور تطاول انگیزیوں سے بچ گئے۔ صرف اتنا ہی نہیں ہوا کہ ان کی دراز دستیوں سے بچ گئے بلکہ رزق اور قوت کے ان تمام سرچشموں کے مالک بن گئے جو اس سے پہلے ہندوؤں کی واحد اجارہ داری میں تھے۔ پاکستانی علاقہ کی تمام تجارت، صنعت و حرفت کاروبار، ذرائع پیداوار اور اسباب مواصلات سب کے سب مسلمانوں کے ہاتھ میں ہیں۔ کیا مشترکہ ہند میں کوئی مسلمان اس کا خواب بھی دیکھ سکتا تھا۔ اس وقت مسلمان کے حصے میں حمالی تھی یا بقالی۔ وہاں کوئی میدان ایسا نہ تھا جس میں مسلمان ہندو کا مقابلہ کرسکتا۔ اب یہاں کوئی میدان ایسا نہیں جس میں اس کے راستہ میں ہندو حائل ہو۔ کیا یہ خدا کا کم انعام ہے وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ﴿۲۷﴾ (33:27) کہ اس نے تمہیں ان کی زمینوں اور شہروں کا اور مال و متاع کا مالک بنا دیا اور اللہ ہر شے پر قادر ہے۔

جو لوگ آج یہ کہتے ہیں کہ تقسیمِ ہند سے تمام مصیبتیں آگئیں۔ یاد رکھو وہ تمہارے بدترین دشمن ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کا یہ انعام تم سے چھن جائے اور تم پھر انہی تنگ نظر گوسالہ پرست ہندوؤں کے غلام بن جاؤ۔ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (43:62) ہندوستان کے مظلوم و مقہور مسلمانوں کے مصائب و نوائب کا یہ حل نہیں کہ چھ کروڑ آزاد مسلمان بھی ان کے ساتھ جاملیں اور انہی مصیبتوں میں مبتلا ہو جائیں۔ اگر آپ کا ایک بھائی جیل خانہ میں ہے تو کیا اس کی مشکلات کا مداوا اس سے ہوتا ہے کہ آپ بھی اس کے ساتھ جیل خانے کی کوٹھڑی میں بند ہو جائیں۔ حل اس کا کچھ اور ہوتا ہے۔

ذرا سوچیے کہ ہندو آج اس قدر اوچھا کیوں ہو رہا ہے۔ جو کچھ اس نے مشرقی پنجاب، دہلی اور گوالیار وغیرہ کے مسلمانوں کے ساتھ کیا۔ جو کچھ اس نے جونا گڑھ، کشمیر اور حیدر آباد کے معاملہ میں اختیار کر رکھی ہے اور جن مشہور عزائم کی بعض جھلکیاں ان کے اکابرین کے جوشِ غیظ و غضب میں، ان کی کف دہانی کے ساتھ دنیا کے سامنے آجاتی ہیں۔ اس کا اصل سبب

کیا ہے؟ آپ غور سے دیکھیں گے تو ان تمام بے انصافیوں اور دست درازیوں کی علت یہ نظر آئے گی کہ ہندوؤں نے یہ خیال کر لیا ہے کہ پاکستان کا مسلمان کمزور ہو چکا ہے۔ بس یہ ایک زعمِ باطل ہے جس میں ہندوؤں کے اس تمام اوچھے پن کا راز پوشیدہ ہے۔ کم ظرف انسان کو جب یہ یقین ہو کہ اس کا فریق مقابل کمزور ہے تو اس کی دنائت وسفالت انتہائی سفا کی اور قصابی میں بدل جایا کرتی ہے۔ یہ ایک محکم اصول ہے جس کا جس جگہ چاہے مطالعہ کر لیجئے۔ یہی اصول آج ہندو کی بیجا تلاطم خیزیوں کی تہ میں کارفرما ہے۔ مغربی پنجاب میں ہندوؤں کے ہاں ایک مثل تھی کہ ''مسلےنوں ٹرخا یئے ٹرخ جائے تو ٹرخ جائے نہیں تو آپ ٹرخ جایئے۔'' مسلمان کو گیدڑ بھپکی دیجئے۔ اگر وہ اس کے رعب میں آجائے تو خوب ورنہ خود دب جایئے۔ آج ہندوستان کا ہندو اپنی قوت کے نشہ کے زعمِ باطل میں اسی قسم کی بھپکیاں دے رہا ہے۔ اگر مسلمان نے یہ سمجھ لیا ہے کہ وہ واقعی کمزور ہو چکا ہے تو ہندوؤں کی بھپکیاں فی الواقع کارگر ہو جائیں گی۔ اور اگر اس کا اس پر ایمان ہے کہ

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم

تو یقین مانئے ہندو اس ضیغم نیستانی کی ایک دھاڑ کو بھی برداشت نہیں کر سکے گا۔ اس میں شبہ نہیں کہ آج مصافِ زندگی میں سپاہ اور اسلحہ بڑی چیز ہے۔ لیکن یاد رکھئے! قوموں کی قوت کا راز ان کی سپاہ اور اسلحہ کی فراوانی میں نہیں ہوتا۔ یہ راز ان کے عزم وثبات اور ایمان ویقین میں پنہاں ہوتا ہے۔ یقین کی قوت دنیا کی ہر قوت پر غالب ہوتی ہے۔ یہی وہ قوت ہے جس کی بناء پر تاریخ کی آنکھوں نے یہ تماشے بھی دیکھے ہیں کہ: كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ (2:249) کتنی ہی چھوٹی جماعتیں تھیں جو بڑی بڑی جماعتوں پر اللہ کے قانون کے ماتحت غالب آگئیں۔ وہ قانون خداوندی کیا ہے؟ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝٢٤٩ یہی کہ اللہ کی نصرت عزم وثبات کا ساتھ دیتی ہے۔ یقین کی قوتیں مادی قوتوں کی کمی کو بھی پورا کر دیتی ہیں۔

مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

اگر اس پر شہادت کی ضرورت ہے تو پوچھئے بدر وحنین کے ذرّات سے جنہوں نے مومنین کو بے تیغ لڑتے اور فاتح ومنصور لوٹتے دیکھا ہے۔ یقین کی قوت فریقِ مقابل کے سپاہ واسلحہ کو تو خاطر ہی میں نہیں لاتی ان کی تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖۗ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ۝١٧٣ (3:173)

یہ وہ لوگ ہیں جن سے بعض آدمی کہتے تھے کہ تم سے جنگ کرنے کے لئے دشمن نے بہت بڑا لشکر اکٹھا کر رکھا ہے سو تم ان سے ڈرو اور مقابلہ کے لئے نہ نکلو لیکن یہ بات سن کر بجائے اس کے کہ وہ ڈر جاتے ان کا ایمان اور مضبوط ہو گیا۔ اور وہ (بے خوف وخطر) پکار اٹھے کہ ہمارے لئے اللہ کا سہارا بس کر دیتا ہے۔ اور جس کا کارساز اللہ ہو تو کیا ہی اچھا اس کا کارساز ہے

اور اس کا نتیجہ

فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ؕ (3:174)

یہ لوگ (مقابلے کے لئے نکلے اور) اللہ کی نعمت اور فضل سے شادکام واپس لوٹے

کوئی گزند انہیں چھونہ سکا اور وہ اللہ کی خوشنودیوں کی راہ میں گامزن ہوئے

مسلمان کسی پر زیادتی نہیں کرسکتا۔ وہ خواہ مخواہ جنگ کی آگ کو مشتعل نہیں کرتا۔ وہ دنیا میں امن وسلامتی چاہتا ہے لیکن وہ کسی اور کو بھی اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ امن کو خراب کرے اور خدا کی مخلوق کو ستائے۔ ہندوؤں نے گزشتہ عرصہ میں دنیا پر روشن کردیا ہے کہ وہ کس قدر امن وسلامتی کا دشمن اور ظلم وفساد کا رسیا ہے اور اس کی علت جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے: صرف یہ ہے کہ وہ سمجھے بیٹھا ہے کہ پاکستان کا مسلمان کمزور ہے۔ لہٰذا ہندو کے دماغی خلل کا علاج یہ ہے کہ اس کے دل سے یہ زعم باطل نکال دیا جائے کہ مسلمان کمزور ہے۔ اور یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ مسلمان اس کا عزم کرلے کہ جو آنکھ ان کی طرف بری نیت سے دیکھے گی وہ آنکھ نکال لی جائے گی۔ خواہ وہ کسی سر میں کیوں نہ ہو۔ اگر ہندوؤں نے کسی سمت سے بھی اپنے قدم بڑھائے تو مسلمانوں کی طرف سے اس کا جواب وہی ہونا چاہیئے جو ابدالی کی تلوار نے پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو دیا تھا۔ یاد رکھیئے اگر ہندو کو ایک شکست مل گئی تو پھر وہ خود بھی امن سے رہے گا اور دنیا کا امن بھی بحال ہوجائے گا۔ اور اس کے بعد ہندوستان کے چار کروڑ مسلمان بھی عزت وآبرو کی زندگی بسر کرسکیں گے۔ پھر سن رکھیئے کہ اس کے لئے فوج اور اسلحہ پر ہی نہ بیٹھے رہیئے۔ جب تک پوری کی پوری قوم عزم وثبات سے مقابلہ نہ کرے فوج اور اسلحہ کچھ نہیں کرسکتا۔ پاکستان کی قوت کا راز مسلمانوں کے عزم وثبات میں ہے، جو تمہیں یہ کہتا ہے کہ تم کمزور ہو وہ ملت کا بدترین دشمن ہے۔ اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۠ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٧٥﴾ (3:175) ''یہ شیطان ہے جو تمہیں اپنے ساتھیوں سے ڈرانا چاہتا ہے۔ اگر تم ایمان رکھتے ہو تو شیطان کے ساتھیوں سے نہ ڈرو۔ اللہ سے ڈرو''، تمہیں سال گزشتہ کی قیامتِ صغریٰ سے اس حقیقت کا خود تجربہ ہوچکا ہے کہ وہ مرتا ہے جو موت سے بھاگتا ہے۔ جو سامنے کھڑا ہوجائے موت اس سے خوف کھاتی ہے۔

> یہ خطۂ ارض قرآنی نظام کے احیاء وترویج کی تجربہ گاہ بننے کے لئے تمہیں دیا گیا ہے۔ سوچو کہ اگر تم نے ہمت ہاردی تو نوعِ انسانی خدا کی کتنی عظیم نعمتوں سے محروم رہ جائے گی اور پھر ان کی تمام ظلمت کاریوں کی ذمہ داری کس پر عائد ہوگی؟

یہ درست ہے کہ ہمارے اکابرین ہماری توقعات پر پورے نہیں اتر رہے جو ہم نے اُن سے وابستہ کی تھیں یہ بھی ٹھیک ہے کہ ہماری حکومت کی مشینری میں بہت سے نقائص ہیں، لیکن یہ چیزیں قطعاً اس کا جواز نہیں ہوسکتیں کہ آپ پاکستان کے استحکام کی طرف سے بے نیاز ہوجائیں۔ پاکستان تمام ملتِ اسلامیہ کی مشترکہ امانت ہے۔ ہمارے اکابر واعیان اس امانت کے واحد مالک نہیں کہ اس کے ضائع ہونے میں صرف انہیں کا نقصان ہوگا۔ ہمارا کچھ نہ بگڑے گا۔ یہ تو وہ آگ ہوگی جس کے شعلوں سے نہ خواص ہی بچ سکیں گے نہ عوام۔ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿٢٥﴾ (8:25) ''اس عظیم فتنے سے اپنا بچاؤ کرلو جو صرف اِن ہی تک محدود نہیں رہے گا۔ جو تم میں سے زیادتی کرنے والے ہیں۔ یاد رکھو۔ اللہ کا قانونِ مکافات بڑا سخت گیر ہے لہٰذا اپنے کارکنان حکومت کی خامکاریوں کی طرف نہ جاؤ۔ ان کی بدنظمیوں کی وجہ سے پیدا شدہ پریشان حالیوں کی طرف نہ جاؤ، اپنے سامنے پاکستان کا استحکام رکھو کہ پاکستان

کی بقاء خود تمہاری اپنی بقا ہے۔

کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے، جام رہے!

موجودہ فنون جنگ میں دشمن کا سب سے بڑا حربہ یہ ہوتا ہے کہ وہ فریقِ مقابل میں خوف وہراس پھیلا دیتا ہے تا کہ ان میں انتشار واختلال پیدا ہو جائے۔ امن کے زمانے میں اس قسم کی وحشت انگیزی اور دہشت افشانی سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ قومِ مخالف کے عزم وثبات کا جائزہ لیا جائے اس تخویف وترہیب کا جواب جمعیت خاطر اور سکونِ دماغ ہے۔ اگر ہم نے اس قسم کی وحشت انگیز خبروں کو سُن کر بھاگنا شروع کر دیا تو یاد رکھئے یہ خواہ مخواہ دشمن کو حملہ کی دعوت دینا ہے۔ جب کبھی اس قسم کی دہشت انگیز افواہیں پھیلیں ان کے پیچھے یونہی نہیں لگ جانا چاہئے بلکہ ان کی تحقیق کر لینی چاہئے ۔اِنۡ جَآءَكُمۡ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوۡۤا اَنۡ تُصِيۡبُوۡا قَوۡمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصۡبِحُوۡا عَلٰى مَا فَعَلۡتُمۡ نٰدِمِيۡنَ (49:6) جب کوئی فتنہ جو تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو ہمیشہ اس خبر کی تحقیق کر لیا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ بے خبری میں تم قوم کو نقصان پہنچا دو اور پھر اپنے کئے پر نادم ہونا پڑے خبروں کی تحقیق بھی انفرادی طور پر نہیں ہونی چاہئے۔ بلکہ ایسے امور کے لئے حکومت کی طرف مراجعت کرنی چاہئے۔

سورۃ النساء میں ہے:

وَاِذَا جَآءَهُمۡ اَمۡرٌ مِّنَ الۡاَمۡنِ اَوِ الۡخَـوۡفِ اَذَاعُوۡا بِهٖ‌ ؕ وَلَوۡ رَدُّوۡهُ اِلَى الرَّسُوۡلِ وَاِلٰٓى اُولِى الۡاَمۡرِ مِنۡهُمۡ لَعَلِمَهُ الَّذِيۡنَ يَسۡتَنۡۢبِطُوۡنَهٗ مِنۡهُمۡ‌ؕ (4:83)

جب کوئی امن یا خوف کی بات ان تک پہنچتی ہے تو وہ اسے خوب پھیلاتے ہیں۔ وہ اگر ایسی خبر رسول ﷺ کی طرف یا ان لوگوں کی طرف جو صاحبِ اختیار ہیں لوٹاتے تو جو ان میں بات کی تہ تک پہنچتے ہیں وہ اس حقیقت کو پرکھ لیتے۔

جب کبھی کوئی ایسی خبر پھیلے تو اسے اربابِ حکومت کی طرف منتقل کر دینا چاہیے تا کہ وہ اس کی تحقیق کر لیں۔ اگر یہ خبر صحیح نکلے تو پھر تمام اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر اس مقصد وحید کے لیے آہنی دیوار کی طرح جم کر کھڑے ہو جاؤ۔ اور کوئی حرکت ایسی نہ کرو جس سے تمہاری ہوا اکھڑ جائے۔ وَلَا تَنَازَعُوۡا فَتَفۡشَلُوۡا وَتَذۡهَبَ رِيۡحُكُمۡ (8:46) ایسے میں ایک دوسرے سے جھگڑا مت کرو۔ ورنہ تم پست ہمت ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ وَاصۡبِرُوۡا‌ ؕ (8:46) ثابت قدم رہو کہ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيۡنَ‌ۚ ۝۴۶ اللہ کی نصرت ثبات واستقلال سے مشروط ہوتی ہے اور جب دشمن کا مقابلہ ہو تو فَاثۡبُتُوۡا وَاذۡكُرُوا اللّٰهَ كَثِيۡرًا لَّعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ‌ۚ ۝۴۵ (8:45) قدم جما کر سامنے آ جاؤ اور ہر وقت اللہ کی نصرت کو سامنے رکھو اور اس کی یاد دل میں۔ یہی کامیابی کا راز ہے۔ فَلَا تُوَلُّوۡهُمُ الۡاَدۡبَارَ‌ۚ ۝۱۵ (8:15) دشمن کو پیٹھ دکھا کر نہ بھاگ کھڑے ہو۔ عزم وثبات سے کھڑے ہونا۔ اللہ کی موہبت نے تمہیں بڑی فراواں قوتوں کا مالک بنا دیا ہے۔ مسلمان جیسا سپاہی دنیا کی کوئی اور قوم پیدا نہیں کر سکی۔ پاکستان کے ذرائع پیدائش اتنے وسیع ہیں کہ ساری دنیا تمہاری محتاج ہو گی اور تم دنیا میں کسی کے محتاج نہیں ہو گے۔ آج بھی دنیا کے بازار بیع و

شریٰ میں تمہاری ساکھ بہت بڑی ہے۔تم جم کر کھڑے ہو گئے تو اس ستون کے سہارے پورے عالم اسلامی کی عمارت کھڑی ہو جائے گی۔کیا تم نے اس بچے کی بات نہیں سنی۔جو کوفہ کے بازار میں جا رہا تھا۔بارش سے بازار میں کیچڑ ہو رہی تھی اور بچہ تیزی سے چل رہا تھا۔پیچھے پیچھے امام اعظمؒ آ رہے تھے۔انہوں نے کہا، بیٹا! سنبھل کر چلو۔پاؤں پھسلا تو گر پڑو گے۔بچے نے مڑ کر دیکھا تو عرض کیا! حضور! میری فکر نہ کیجئے۔اپنا پاؤں سنبھالئے۔میں پھسلا تو تنہا میں ہی گروں گا۔اگر خدانخواستہ آپ پھسل گئے تو سارا عالم اسلامی نیچے آ گرے گا۔پاکستان کے مسلمانو! عالم اسلامی میں آج تمہارا مقام، مقامِ اعظم ہے۔تمہارے سنبھلنے سے عالم اسلامی سنبھل جائے گا اور تمہارے پھسلنے سے ساری اسلامی دنیا پھسل جائے گی۔صرف اسلامی دنیا ہی نہیں بلکہ اس سے بھی کچھ آگے۔ یہ خطۂ ارض قرآنی نظام کے احیاء و ترویج کی تجربہ گاہ بننے کے لئے تمہیں دیا گیا ہے۔سوچو کہ اگر تم نے ہمت ہار دی تو نوعِ انسانی خدا کی کتنی عظیم نعمتوں سے محروم رہ جائے گی اور پھر ان کی تمام ظلمت کاریوں کی ذمہ داری کس پر عائد ہو گی؟

بے خبر! تُو جوہرِ آئینۂ ایّام ہے
تُو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

اللہ نے تمہیں نوعِ انسانی کی امامت کے لئے منتخب کیا ہے۔اجتباء و اصطفاء کا یہ مقام ہر کسی کے حصہ میں نہیں آتا وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ (5:7) اللہ کے انعامات و احسانات کو سامنے رکھو اور پھر سوچو کہ تمہارا فریضۂ زندگی اور نصب العینِ حیات کیا ہونا چاہئے! اللہ تمہیں اس مقام پر لیجانا چاہتا ہے۔لیکن اگر تم ان ہندوؤں کے سامنے جُھک گئے جو خود پتھروں اور حیوانوں کے سامنے جھکتے ہیں تو سمجھ لو کہ دنیائے انسانیت میں یہ کتنی بڑی گراوٹ ہو گی۔حکومت جو کچھ اس ضمن میں کر رہی ہے کرنے دو لیکن تم خود اپنے اپنے طور پر، اپنی اپنی جگہ پر منظم ہو جاؤ۔گاؤں گاؤں، قریہ قریہ، شہر شہر، محلّہ محلّہ اپنی تنظیم کرتے جاؤ، بس ایک مقصد کے لئے اور وہ مقصد ہے استحکام پاکستان تاکہ اس میں خدا کی حکومت قائم ہو سکے۔بیس آدمی جمع ہو جاؤ اور اپنے میں سے ایک سرکردہ منتخب کر لو یہ بیس اس سرکردہ کے پیچھے چلیں۔اور پھر بیس سرکردہ جمع ہو کر اپنے میں سے ایک سرکردہ منتخب کر لیں اور اس طرح سے یہ سلسلہ دراز ہمہ گیر ہوتا چلا جائے تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا (34:46) اللہ کے لئے ایک ایک دو دو کر کے کھڑے ہو جاؤ پھر سوچو کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔بس یہ ہے حقیقی کامیابی کا راز۔

اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو پھر سارا پاکستان اسی طرح سے بُت کدہ بن جائے گا جس طرح سومنات کی مسجد بتخانہ بنا دی گئی۔قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴿۲۳﴾

سانحہ ارتحال

انتہائی دکھ اور افسوس کے ساتھ خبر دی جاتی ہے، کہ بزم طلوع اسلام مینگورہ سوات کے ایک فعال کارکن محمد ریاض صاحب، ساکن تھانہ، طویل علالت کے بعد وفات پا گئے ہیں۔دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں بلند مقام عطا فرمائیں اور لواحقین کو صبر جمیل عنایت فرمائیں۔ادارہ لواحقین کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ (چیئرمین ادارہ طلوعِ اسلام)

ادارہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

جِہاد

یوں تو یہ سوال آج ہر ذہن میں ابھر رہا ہے کہ ہندوستان کی طرف سے جو حالات پیدا کئے جا رہے ہیں ان میں قرآنِ کریم ہماری کیا راہ نمائی کرتا ہے اور مسلمانانِ پاکستان پر اس سلسلہ میں کیا فریضہ عائد ہوتا ہے۔ بزمہائے طلوع اسلام کی سالانہ کنونشن کی مجلس استفسارات میں ایک صاحب کی طرف سے یہ سوال پرویز صاحب سے متعین طور پر پوچھا گیا تھا۔ انہوں نے اس کا مختصر جواب وہیں اپنے درس قرآن میں دے دیا تھا۔ اس کے بعد، بزم لاہور نے اس مقصد کے لئے (لاہور میں) ایک جلسۂ عام کا انتظام کیا تھا (1965ء) جس میں پرویز صاحب نے اس موضوع سے متعلق تفصیل سے خطاب کیا تھا جس کا ماحصل درج ذیل ہے۔ (طلوع اسلام)

جہاد کے معنی:

برادرانِ عزیز! مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں جہاد کے عنوان پر، قرآنِ کریم کی روشنی میں آپ احباب سے خطاب کروں۔ جہادؔ کے معنی ہیں کسی مقصد کے حصول کے لئے مسلسل جدوجہد کرنا۔ ایمان اس مقصد کو متعین کرتا ہے جو مومن کا منتہائے نگاہ قرار پاتا ہے اور عملِ صالح اس جدوجہد کا نام ہے جو اس مقصد کے حصول کے لئے کی جائے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو اسلامؔ اور جہادؔ اور مومن اور مجاہد، مرادف الفاظ ہیں۔ اسلام نام ہی یقینِ محکم اور عملِ پیہم کا ہے اور اسی کو جہاد کہا جاتا ہے۔ یعنی مسلسل حرکت پیہم سعی و عمل، لگاتار کوشش مدام جدوجہد۔ اور اسی کا دوسرا نام زندگی بھی ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

پُختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

بلکہ یہ کہ ــــ زندگی جہد است و استحقاق نیست ــــ یعنی زندگی یونہی بیٹھے بٹھائے بطورِ حق کے نہیں مل جاتی۔ اسے مسلسل سعی و عمل اور پیہم کد و کاوش سے حاصل کرنا پڑتا ہے۔ یہی وہ بنیادی حقیقت ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآنِ کریم میں کہا گیا ہے کہ: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ ۚ (8:24) اے جماعت مومنین تم خدا اور رسول کی آواز پر لبیک کہو جب وہ تمہیں اس چیز کی طرف دعوت دے جو تمہیں زندگی عطا کرتی ہے۔ اور اس امتیاز کو انسانی زندگی کے ہر گوشے میں اور ہر قدم پر یہ کہہ کر نمایاں کر دیا کہ: لَا یَسْتَوِی الْقٰعِدُوْنَ مِنَ

الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ (4:95)۔جدوجہد کرنے والے اور بیٹھے رہنے والے کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا (4:95) خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے جدوجہد کرنے والوں کو بیٹھے رہنے والوں پر بڑی فضیلت حال ہوتی ہے اوران کے لئے اجرِ عظیم ہے۔

قتال:

جیسا کہ میں نے ابھی بھی کہا ہے، جہاد، زندگی کے ہر گوشے میں مسلسل جدوجہد کا نام ہے۔لیکن اس جدوجہد کا آخری گوشہ وہ ہوتا ہے جہاں ایک مردمومن اپنے بلند و بالا مقصد کے حصول کے لئے سربکف میدانِ جنگ میں آجاتا ہے۔اس مرحلہ کے لئے قرآنِ کریم نے قتال کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔اس نقطہ نگاہ سے دیکھئے تو جہاد میں قتال بھی شامل ہوتا ہے لیکن قتال جہاد کے ایک (اور آخری) گوشے کا نام ہے۔ یا یوں کہئے کہ قتال، جہاد کے سلسلہ کی آخری کڑی ہے۔جس موضوع کے متعلق مجھ سے خطاب کرنے کے لئے کہا گیا ہے اس سے مراد جہاد کا یہی آخری گوشہ، یعنی قتال ہی ہے۔اس لئے میری معروضات بھی سردست، اس گوشہ تک محدود رہیں گی۔اور یہی وقت کا تقاضا بھی ہے۔وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ۔۔۔

امن وسلامتی کا دین:

اسلام، امن وسلامتی عطا کرنے والا نظامِ زندگی ہے (خود لفظ اسلام کے مفہوم میں یہ حقیقت داخل ہے)۔خدا کا ایک نام السلام۔اور دوسرا المومن ہے۔المومن کے معنی ہیں امنِ عالم کا ذمہ دار۔اس اعتبار سے دیکھئے تو مومن بھی خدا کی اسی صفت کا آئینہ دار ہے۔سب سے پہلا عبد مومن خود رسول ہوتا ہے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق فرمایا کہ وہ رسولِ امین تھے۔(خدا کا ہر رسول امین ہوتا تھا)۔اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو جماعتِ مومنین کا اوّلین فریضہ دنیا میں امن قائم کردینا اور اسے برقرار رکھنا ہے۔اس امت کی بعثت کے متعلق کہا گیا ہے: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (3:110) تم وہ بہترین قوم ہو جسے نوعِ انسانی کی بھلائی کے لئے کھڑا کیا گیا ہے۔اور ظاہر ہے کہ نوعِ انسان کی بھلائی میں امن کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔اگر دنیا میں امن ہی قائم نہ رہے تو بھلائی کا امکان کہاں ہوگا، امن کی ضد، فساد ہے اور فساد کو خدا نے انسانیت کی عدالت میں سنگین تریں جرم قرار دیا ہے۔مفسدین اس کے نزدیک بدترین مجرم ہیں۔فساد میں انسانی جانیں تلف ہوجاتی ہیں۔اور انسانی جان کی قیمت اس کے نزدیک اتنی بڑی ہے کہ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ یاد رکھو! جس نے کسی ایک جان کو بھی ناحق تلف کردیا۔یوں سمجھو کہ اس نے پوری کی پوری نوعِ انسانی کو قتل کردیا۔اور جس نے کسی ایک جان کو بھی بچالیا اس نے گویا پوری نوعِ انسانی کو زندگی عطا کردی (5:32)۔

فساد:

اس سے ظاہر ہے کہ جماعت مومنین خود امن میں رہے گی اور دوسروں کے امن میں کبھی خلل انداز نہیں ہوگی۔لیکن سوال یہ ہے کہ جب دنیا کی سرکش اور مستبد قوتیں، امن عالم میں خلل انداز، ہوں تو اس سلسلہ میں جماعت مومنین پر کوئی

فریضہ عائد ہوتا ہے یا نہیں؟ کیا ایسی صورت میں انہیں خاموشی سے بیٹھے یاد اللہ میں مصروف رہنا چاہئے یا کچھ اور کرنا چاہئے؟

ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ امن عالم کا فساد قائم رکھنا خدا کی ذمہ داری ہے۔ لیکن انسانی دنیا میں خدا اپنی ذمہ داریاں خود انسانوں کے ہاتھوں سے پوری کرایا کرتا ہے۔ چنانچہ اس مقام پر اس نے کہا ہے کہ:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ (2:251)

اگر خدا سرکش اور مستبد قوتوں کی روک تھام دوسرے لوگوں کے ہاتھوں نہ کراتا تو دنیا میں فساد برپا ہو جاتا۔

اور فساد کی تشریح دوسرے مقام پر ان الفاظ میں کردی کہ:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا (22:40)

اگر خدا مستبد قوتوں کی روک تھام دوسری جماعتوں سے نہ کراتا رہتا تو (دنیا سے مذہبی آزادی ختم ہوجاتی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ) مختلف اہلِ مذاہب کی پرستش گاہیں ___ یہودیوں کے صومعے۔ عیسائیوں کے گرجے۔ راہبوں کی کوٹھڑیاں۔ مسلمانوں کی مسجدیں جن میں خدا کا ذکر اکثر ہوتا رہتا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی باقی نہ رہتی۔ سب ایک دوسرے کے ہاتھوں منہدم ہوجاتیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کی رُو سے مذہبی آزادی کو کس قدر اہمیت حاصل ہے اور اسے برقرار رکھنے کے لئے خدا کیا انتظام کرتا ہے۔ بہرحال ہم نے یہ دیکھ لیا ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے، امن عالم برقرار رکھنے کی خدا کی ذمہ داری یوں پوری ہوتی ہے کہ جب کوئی قوم جونشۂ قوت سے بدمست ہو، دوسروں کے امن میں خلل انداز ہو، تو اس کی روک تھام دوسری جماعتوں کے ہاتھوں سے کرائی جاتی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یہ دوسری جماعت، جماعتِ مومنین کے سوا اور کون ہوسکتی ہے، یہی وہ جماعت ہے جو انسانی دنیا میں خدا کی ذمہ داریوں کے پورے کرنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ اسی لئے مندرجہ بالا آیت کے آخر میں فرمایا کہ: وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ (22:40)، جو خدا کی مدد کرتا ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری سے عہدہ برا ہو جائے خدا کا قانون اس کی مدد کرتا ہے۔ اور اسے ایسا کرنا بھی چاہئے۔ اسی لئے اس نے کہا ہے کہ: وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ (30:47) جماعت مومنین کی مدد کرنا ہم پر لازم ہوجاتا ہے۔

❁❁❁❁❁

سوال یہ ہے کہ سرکش اور مستبد قوتوں کی روک تھام کس طرح کی جائے گی؟ اس سوال کا جواب بالکل واضح ہے۔ جب یہ دیکھا جائے کہ ان کی روک تھام کے لئے تمام مصالحانہ تدبیریں ناکام ہوچکی ہیں اور یہ کسی معقول بات کے سننے کے لئے تیار ہی نہیں تو پھر اس کے سوا چارہ کار ہی کیا رہ جاتا ہے کہ ان کی روک تھام قوت سے کی جائے۔ یہ ہے وہ مقصد جس کے لئے قرآن

کریم نے کہا کہ: لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَیِّنٰتِ وَاَنۡزَلۡنَا مَعَھُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡمِیۡزَانَ (57:25) ہم نے اپنے رسولوں علیہم السلام کو واضح دلائل اور ضوابط قانون دے کر بھیجا۔ اور میزان عدل بھی۔ لِیَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ ۚ تاکہ لوگ عدل کو قائم رکھ سکیں۔ اس کے بعد ہے وَاَنۡزَلۡنَا الۡحَدِیۡدَ فِیۡهِ بَاۡسٌ شَدِیۡدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۔۔۔ ان کے ساتھ ہم نے فولاد (شمشیر خارہ شگاف) بھی نازل کیا جس میں بڑی سختی ہوتی ہے اور لوگوں کے لئے بے شمار فائدے۔ یہ کیوں نازل کی گئی؟ اُسی مقصد کے لئے جس کا پہلے ذکر آ چکا ہے۔ یعنی خدا کی مدد کرنے کے لئے وَلِیَعۡلَمَ اللّٰهُ مَنۡ یَّنۡصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالۡغَیۡبِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیۡزٌ ﴿۲۵﴾ (57:25) تاکہ یہ دیکھ لیا جائے کہ کون خدا اور اس کے رسولوں کی ایسے مراحل میں مدد کرتا ہے جن میں انسان کو ہر قسم کی مشکلات اور مصائب برداشت کرنے ہوتے ہیں، اور ان کے نتائج ہنوز نگاہوں سے اُوجھل ہوتے ہیں۔ اس سے دنیا کے سامنے یہ حقیقت آ جاتی ہے کہ خدا کا یہ نظام کس قدر غلبہ اور قوت کا مالک ہے۔

آپ نے غور کیا کہ اس مقام پر اسلام مذاہب کی دنیا سے الگ ہو کر کس طرح ایک عملی نظامِ زندگی (دین) کی حیثیت سے سامنے آتا ہے، دنیائے مذاہب میں ایسے مقام پر کہا جائے گا کہ جب سرکش قوتیں ظلم وزیادتی پر اتر آئیں تو خدا پرست انسان کو چاہیئے کہ وہ ان مظالم کو صبر اور سکون سے برداشت کرے۔ وہ اگر ایک گال پر طمانچہ ماریں تو دوسرا گال ان کے سامنے کر دے۔ لیکن اسلام تو نظامِ حیات ہے۔ وہ دنیا میں عملاً رہنا اور اس کا امن قائم رکھنا سکھاتا ہے۔ اس کے لئے اس نے کہا کہ جس خدا نے دلائل وبراہین اور ضوابط قانون نازل کئے ہیں اسی نے ان کے ساتھ شمشیر خارہ شگاف بھی نازل کی ہے۔ اور ان دونوں کے مجموعے سے دین ترتیب پاتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

سوچا بھی ہے اے مردِ مسلماں کبھی تُو نے
کیا چیز ہے فولاد کی شمشیرِ جگردار
اُس بیت کا یہ مصرعِ اوّل ہے کہ جس میں
پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار

تلوار اور قرآن:

یہ اُس بیت کا مصرع اوّل ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کا دوسرا مصرعہ کیا ہے جس کے ساتھ مل کر یہ مصرعہ اوّل، مکمل شعر بنتا ہے؟ اس کے لئے انہوں نے جاوید نامہ میں کہا ہے کہ ؎

مومناں را تیغ با قرآں بس است

یعنی قرآن اور تلوار، دونوں مل کر نظمِ زندگی کا مکمل شعر بنتے ہیں۔ اور ان کی کیفیت یہ ہے کہ ؎

ایں دو قوت حافظِ یک دیگر اند
کائناتِ زندگی را محور اند!

تلوار (قوت) قرآن کی حفاظت کرتی ہے کہ سرکش اور بے باک قوتیں، اس ضابطہ زندگی کو عاجز و ناتواں بنا کر، دین کو مذہب میں تبدیل نہ کر دیں اور اس طرح خود من مانی کرنے لگ جائیں۔ اور قرآن تلوار کی حفاظت کے لئے ہے کہ اسے صرف اس مقام پر استعمال کیا جائے جہاں قانونِ خداوندی اس کی اجازت دے۔ اپنی ہوسِ اقتدار کی تسکین کے لئے استعمال نہ کیا جائے۔ وہ کونسے مقامات ہیں جہاں قرآن، تلوار کے استعمال کی اجازت دیتا ہے، اس کا ذکر ذرا آگے چل کر آئے گا۔

۞۞۞۞۞

اپنی سرحدوں کی حفاظت:

یہ واضح ہے کہ اسلام ایک نظامِ زندگی ہے جو ایک آزاد خطۂ زمین ہی میں متشکل ہو سکتا ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے ضروری یہ ہے کہ یہ خطۂ زمین ہر قسم کے خطرات سے محفوظ ہے، کہ اگر یہی محفوظ نہ رہا تو جماعتِ مومنین خود ہی امن میں نہیں رہ سکے گی۔ چہ جائیکہ وہ امنِ عالم کے قیام کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس مملکت کی سرحدوں کو مضبوط رکھا جائے اور ہر خطرہ کے مقابلہ کے لئے پوری پوری تیاری کی جائے اس سلسلہ میں قرآنِ کریم میں ہے:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ؕ (8:60)

ان کی روک تھام کے لئے تم اپنے امکان بھر قوت فراہم کرو۔ حفاظت کے لئے اپنی سرحدوں پر فوجی چھاؤنیاں ڈالو۔ تاکہ اس سے تمہارے اور تمہارے نظامِ خداوندی کے دشمنوں کے دل میں تمہاری دھاک بیٹھی رہے۔ ان دشمنوں کے علاوہ ان دشمنوں کے دلوں میں بھی جنہیں ابھی تم نہیں جانتے لیکن خدا کو ان کا علم ہے۔

اس لئے کہ جب تک کسی ملک کی سرحدیں مضبوط اور محکم نہیں ہوں گی، وہ ملک محفوظ نہیں رہ سکے گا۔ اور جب ملک ہی محفوظ نہیں ہوگا تو اس کا نظام کس طرح محفوظ اور برقرار رہ سکے گا؟

حفاظت پھول کی ممکن نہیں ہے
اگر کانٹے میں ہو خُوئے حریری

پھول کی حفاظت کے لئے کانٹوں کا وجود ضروری ہے۔ لیکن ان کا وجود مقصود بالذات نہیں۔ ان کا مقصد پھول کی حفاظت ہے، نہ کہ خواہ مخواہ راہ چلتوں کے ہاتھوں کو زخمی کرنا۔

جنگ کی اجازت:

یہ تو رہی حفاظتی تدابیر۔ اگر سرکش قوتیں ان تدابیر کے باوجود آگے بڑھتی چلی آئیں تو پھر کیا کیا جائے؟ اس کا جواب ظاہر ہے۔ لیکن اس جواب کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے اُس پس منظر کا سامنے لانا ضروری ہے جس میں یہ جواب دیا گیا تھا۔

نبی اکرم ﷺ ـــــ اور آپ ﷺ کے رفقاء رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مختصر سی جماعت نے تیرہ برس تک مکہ میں، ہر قسم کے مظالم برداشت کئے اور بالآخر اپنا گھر بار۔ خویش و اقارب، اسباب و متاع چھوڑ کر مدینہ چلے آئے۔ لیکن ان مخالفین نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ اور ایک لشکرِ جرار لے کر مدینہ پر چڑھ دوڑے۔ اس مقام پر خدا کی طرف سے یہ وحی نازل ہوئی کہ: اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ (22:39)۔ یہ لوگ جن پر اس قدر ظلم و زیادتی کی جارہی ہے انہیں اجازت دی جاتی ہے کہ یہ بھی میدانِ جنگ میں اتر آئیں۔ اس کے سوا اب کوئی اور چارہ کار نہیں۔ اور چونکہ یہ ظلم اور زیادتی کی روک تھام کے لئے میدانِ جنگ آئیں گے اس لئے وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۟ ... خدا ان کی مدد کرے گا۔ اَلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ (22:40)۔ یہ وہ مظلوم ہیں جنہیں ناحق ان کے گھروں سے نکال دیا گیا، صرف اس جرم کی پاداش میں کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا نشوونما دینے والا اللہ ہے۔ دوسرے مقام پر ہے۔ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ (2:190) جو لوگ تم سے جنگ کرنے کے لئے یوں امنڈ آئے ہیں، تم ان سے جنگ کر سکتے ہو۔ لیکن تمہاری یہ جنگ فی سبیل اللہ ہوگی یعنی حق و صداقت کی حفاظت کی خاطر۔ دنیا سے ظلم و استبداد کو مٹانے کی خاطر۔ اور اس کے بعد ہے: وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ تم ان کے خلاف جنگ تو کر سکتے ہو لیکن حد سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ ظلم اور زیادتی نہیں کر سکتے۔ جوشِ انتقام میں حدود فراموش نہیں ہو سکتے۔ ''دشمن سے بھی عدل کرنے'' کی جو تاکید خدا نے کی ہے تم اس کے خلاف نہیں جا سکتے۔

آپ نے دیکھا کہ جہاں تلوار، قرآن کی حفاظت کے لئے اُٹھ رہی تھی، وہیں تلوار کی حفاظت کے لئے قرآن آگے بڑھ آیا اور اسے کہہ دیا کہ تم اس حد تک جا سکتی ہو۔ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ تلوار کے اس حد تک جانے کا مقصد کیا ہے؟ وہی جسے پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ یعنی وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ (8:39)۔ تم ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔ فساد مٹ جائے۔ یعنی دین کا معاملہ صرف اللہ کے لئے رہ جائے۔ اس میں کوئی مداخلت نہ کر سکے۔ ہر شخص کو مذہبی آزادی حاصل ہو۔

اقوام میں فرق:

یہاں تک معاملہ اپنی حفاظت کے لئے جنگ کرنے کا تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ جماعت اس لئے وجود میں لائی گئی تھی کہ یہ خود محفوظ رہے اور بس! کیا ان کا وجود مقصود بالذات تھا یا کسی اور مقصد کے حصول کا ذریعہ؟ اس کا جواب کچھ مشکل نہیں۔ یہ جماعت پیدا اس لئے کی گئی تھی کہ یہ ظلم اور زیادتی کی روک تھام کرے یہ امنِ عالم کے برقرار رکھنے کی ذمہ دار قرار دی گئی تھی۔ اس لئے انہیں المومنون کہا گیا تھا۔ اگر آپ اس ایک نکتہ پر غور کریں گے تو آپ کو ''اسلامی قومیت'' اور عام دنیاوی قومیت کا فرق نمایاں طور پر نظر آجائے گا۔ دنیا کی ہر قوم اپنے لئے جیتی ہے۔ اس کا مقصدِ زندگی اپنے آپ کو محفوظ اور مستحکم رکھ کر، اپنے لئے زیادہ سے زیادہ قوت، دولت، ثروت حاصل کرنا ہوتا ہے۔ لیکن اُمتِ مسلمہ دنیا میں اس لئے زندہ رہتی ہے کہ وہ ہر مظلوم، کمزور، ناتوان کی حفاظت کا موجب ہے۔ اس کا مقصد، خود تیر کر ساحل تک پہنچ جانا نہیں ہوتا۔ ڈوبنے والوں

کو بچانا بھی ہوتا ہے۔اس کا نام ''جہاد فی سبیل اللہ'' ہے۔اسی لئے کہا گیا کہ یہ فی سبیل اللہ، جنگ کرتے ہیں اور دوسری قومیں فی سبیل الطاغوت جنگ کرتی ہیں (4:76) لہٰذا اُنہیں کہیں سے بھی مظلوم مدد کے لئے پکارے ___ اور وہ کوئی بھی ہو ___ ان کا فریضہ ہے کہ یہ اس کی مدد کے لئے پہنچیں۔

جنگ کی تاکید:

یہ ہے وہ مقام جہاں انہیں جنگ کی اجازت نہیں بلکہ جنگ کی تاکید کی جاتی ہے۔سورۃ النساء میں دیکھئے کیسے بلیغ اور مؤثر انداز میں اس حقیقت کو اُبھار کر سامنے لایا گیا ہے فرمایا: وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (4:75) اے جماعتِ مومنین! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں جنگ کے لئے نہیں اٹھتے؟ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ (4:75) تم سنتے نہیں ہو کہ کمزور وناتواں مظلوم ومقہور، مرد، عورت، بچے کس طرح پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ اسے ہمارے نشوونما دینے والے ہمارے لئے اس بستی سے نکلنے کا کوئی سامان پیدا کردے جس کے رہنے والے اس قدر ظلم اور زیادتی پر اتر آئے ہیں۔ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۝ (4:75) ہمارا کوئی والی وارث اور حامی وناصر نہیں۔تو اپنی طرف سے کسی کو ہمارا والی اور مددگار بنا کر بھیج تاکہ وہ ہمیں اس ظلم وتعدی سے نجات دلائے۔

آپ اس حقیقت پر غور کیجئے کہ یہ مظلوم وناتواں، خدا کو مدد کے لئے پکار رہے ہیں اور خدا اس جماعتِ مومنین سے کہہ رہا ہے کہ تم سنتے نہیں کہ وہ کس طرح ہمیں مدد کے لئے پکار رہے ہیں! تم ان کی مدد کے لئے کیوں نہیں اُٹھتے؟ یہ وہی حقیقت ہے جسے پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ انسانی دنیا میں خدا کی ذمہ داریاں، انسانی ہاتھوں سے پوری ہوتی ہیں۔جن لوگوں کے ہاتھوں سے یہ خدائی ذمہ داریاں پوری ہوتی ہیں انہیں خدا نے حِزْبُ اللّٰهِ (خدا کی پارٹی) کہہ کر پکارا ہے۔اور ان کے مخالفین کو حِزْبُ الشَّيْطٰنِ (58:19-22) اور اس عظیم حقیقت کا اعلان کیا ہے کہ جب ان دونوں پارٹیوں کا مقابلہ ہوگا تو خدا کی پارٹی ہمیشہ غالب رہے گی۔

اسلامی جنگیں:

اکثر یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ اسلام میں جنگ مدافعانہ (Defensive) ہوتی ہے یا محاربانہ (Offensive) اور مخالف اور موافق گوشوں سے اس سوال کے عجیب وغریب جوابات دیئے جاتے ہیں۔حالانکہ اس کا جواب بالکل واضح ہے۔ اسلام میں جنگ مدافعانہ ہوتی ہے۔

لیکن اس مدافعت کا تصور عام دنیاوی تصور سے ذرا مختلف ہے۔عام دنیاوی تصور یہ ہے کہ جو جنگ اپنی حفاظت کے لئے لڑی جائے اسے مدافعانہ کہا جائے گا۔لیکن قرآن کی رُو سے جو جنگ ظالم کی روک تھام اور مظلوم کی مدافعت کے لئے کی جائے۔خواہ وہ کہیں ہو اور کوئی ہو ___ اسے مدافعانہ کہا جائے گا۔اس نقطۂ نگاہ سے اسلام کی ہر جنگ مدافعانہ ہوگی۔یعنی دنیا

میں ظلم اور زیادتی کی روک تھام کے لئے۔ اگر جنگ کا مقصد اس کے خلاف کچھ اور ہے تو وہ جنگ محاربانہ ہے اور اسلام اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔ اقبال کے الفاظ میں ؎

تاریخِ اُمَم کا یہ پیامِ ازلی ہے
صاحب نظراں! نشۂ قُوّت ہے خطرناک
اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے
عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک
لا دیں ہو تو ہے زہرِ ہلاہلِ سے بھی بڑھ کر
ہو دِیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک

یہ ہے وہ مقصد جس کے لئے خدا کی یہ پارٹی۔ اللہ کا یہ لشکر، ہر وقت مستعد رہتا ہے۔

خدا اور بندے کا معاہدہ:

قرآنِ کریم ہمیں بتاتا ہے کہ جب کوئی شخص ایمان لا کر مومن بنتا ہے تو یہ ایمان درحقیقت خدا اور بندے کے درمیان ایک معاہدہ ہوتا ہے۔ اس معاہدہ کی رُو سے اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ وَ اَمۡوَالَہُمۡ بِاَنَّ لَہُمُ الۡجَنَّۃَ ؕ (9:111) مومن اپنا مال اور اپنی جان خدا کے ہاتھ بیچ دیتا ہے۔ اور اس کے معاوضہ میں خدا اسے جنت عطا کر دیتا ہے___ اس دنیا میں بھی جنتی معاشرہ اور اگلی دنیا میں بھی جنتی زندگی___ لیکن یہ معاہدہ محض کاغذی کارروائی نہیں ہوتی کہ لفظی طور پر کہہ دیا جائے کہ ہم نے اپنا جان و مال خدا کے ہاتھ بیچ دیا ہے اور اس کے عوض جنت مل جائے یہ معاہدہ عملاً اس طرح پورا ہوتا ہے۔ کہ: یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ فَیَقۡتُلُوۡنَ وَ یُقۡتَلُوۡنَ ۟ (9:111)۔ وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔ پھر یا تو فاتح و منصور لوٹتے ہیں اور یا اپنی جان دے دیتے ہیں یوں اس معاہدہ کی تکمیل ہوتی ہے۔

جہاد کی فضیلت:

جب ایسا وقت آجائے تو پھر دنیا کا کوئی ''نیک کام'' درجہ اور فضیلت میں، اس (جہاد) کا قابلہ نہیں کرسکتا۔ حقیقت یہ کہ ''نیک کام'' (اعمالِ صالح) اس امر کے مظہر ہوتے ہیں کہ انسان ایک عطا کردہ مستقل اقدار کا تحفظ چاہتا ہے۔ ان اقدار کے تحفظ کا طریق یہ ہے کہ جب ان میں اور طبیعی زندگی کے کسی مفاد میں تصادم ہو، تو ان اقدار کو محفوظ رکھا جائے اور اس طبیعی مفاد کو قربان کر دیا جائے، اس طبعی مفادمیں، انسان کی اپنی جان کی حفاظت سب سے زیادہ گراں بہا ہے۔ انسان ہر قیمت پر اپنی جان بچانا چاہتا ہے۔ لیکن جب انسان کی جان اور مستقل اقدار میں ٹکراؤ ہو تو اس وقت جان دے کر ان اقدار کی حفاظت کر لینا بہت بڑی قربانی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑا نیک عمل اور کونسا ہوسکتا ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ: اَجَعَلۡتُمۡ سِقَایَۃَ الۡحَآجِّ وَ عِمَارَۃَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ کَمَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ جٰہَدَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ (9:19)۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ حاجیوں

کے پانی پینے کی سبیلیں لگا دینا اور مسجدِ حرام کی تعمیر اور آبادکاری۔ اور تزئین و آرائش کے کام کرنا اللہ اور آخرت پر ایمان لا کر اس کے راستے میں جہاد کرنے کے برابر ہو سکتے ہیں؟ تم اپنے ذہن سے کچھ ہی فیصلہ کیوں نہ کر لو۔ حقیقت یہ ہے کہ: لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ ۔۔۔ میزانِ خداوندی میں ان دونوں کا وزن یکساں کبھی نہیں ہو سکتا۔ ایسا سمجھنا ظلم ہے۔ یعنی کسی شے کو اس کے اصلی مقام میں نہ رکھنا۔ اور وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹﴾ خدا کا قانون یہ ہے کہ جو ایسا کرتا ہے اس پر کامیابی کی راہیں کشادہ نہیں ہوتیں۔ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ جو لوگ ایمان لانے کے بعد ہجرت کرتے ہیں اور خدا کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرتے ہیں۔ اللہ کے نزدیک ان کا درجہ بہت بلند ہے۔ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۲۰﴾ ۔۔۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں حقیقی معنوں میں کامیاب و کامران کہا جا سکتا ہے۔ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ﴿۲۱﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۲﴾ (9:21-22) ان کا نشوونما دینے والا انہیں رحمت و رضوان و جنت کی بشارت دیتا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ کے نزدیک ان کا اجر بہت بڑا ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ جب جہاد کا وقت آ جائے تو پھر وہ بڑے سے بڑا کام جسے ہم اپنی دانست میں بڑے ہی اجر اور ثواب کا موجب سمجھتے ہیں جہاد کے مقابلہ میں کس قدر بے وزن ہو کر رہ جاتا ہے۔ سچ کہا ہے کہنے والے نے کہ ؎

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
مُلّا کی اذاں اور، مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے، شاہیں کا جہاں اور

اس وادیٔ عشق و مستی میں جان دینا تو خیر بعد کی بات ہے، یہاں تو مجاہدین کے قدم قدم پر نیکیاں پاؤں چومتی ہیں۔ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ؕ (9:120) یہ مجاہدین بھوک اور پیاس کی جس شدت کو جھیلتے ہیں۔ جو تھکان اور مشقت یہ اٹھاتے ہیں۔ ان کا ہر وہ قدم جو اس مقام پر پڑتا ہے جہاں اس کا پڑنا دشمن کے لئے غیظ و غضب کا موجب ہو۔ جبکہ ہر وہ نقصان جو انہیں فریق مخالف کی طرف سے پہنچتا ہے۔ ان میں سے ایک ایک چیز ان کے لئے عملِ صالح بنتی چلی جاتی ہے اس لئے کہ: اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ (9:121)۔ خدا کا قانونِ مکافات کسی کا حسن کارانہ عمل ضائع نہیں ہونے دیتا۔ وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ (9:121) اور یہ لوگ اس مقصد کے لئے جو کچھ بھی صرف کرتے ہیں۔ خواہ وہ تھوڑا ہو یا بہت۔ یا جو منزل بھی وہ قطع کرتے ہیں۔ یہ سب ساتھ ساتھ لکھے جاتے ہیں تاکہ خدا کا قانون انہیں ان کے اعمال کا حسین ترین صلہ دے۔

خدا کے دست و بازو:

ان مجاہدین کے مدارج بلند کا اندازہ اس سے لگایئے کہ جو کچھ یہ میدانِ جنگ میں کرتے ہیں انہیں خدا خود اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ: فَلَمۡ تَقۡتُلُوۡهُمۡ وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمۡ ۖ (8:17) تم انہیں (دشمنوں کو) قتل نہیں کر رہے تھے، خدا قتل کر رہا تھا۔ وَمَا رَمَيۡتَ اِذۡ رَمَيۡتَ وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ (8:17) تو تیر نہیں چلا رہا تھا۔ خدا خود تیر چلا رہا تھا۔ تلواریں تمہاری تھیں، ہاتھ ہمارے تھے۔ تیر تمہارے تھے، کمانیں ہماری تھیں یہ مجاہد ہیں جو خدا کے دست و باز بنتے ہیں اس لئے کہ یہ خدا کی ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے سر بکف اور کفن بدوش میدان میں نکل آتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں انسان اس حقیقت کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لیتا ہے کہ ؎

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کارکُشا، کارساز

شہید مردہ نہیں:

اس آویزش حق و باطل میں جو سعادت مند افراد اپنی جان دیدیں ان کے متعلق کہا کہ انہیں مردہ مت کہو۔ وَلَا تَقُوۡلُوۡا لِمَنۡ يُّقۡتَلُ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ اَمۡوَاتٌ ؕ (2:154) جو خدا کی راہ میں جان دیدیں انہیں مردہ مت کہو۔ بَلۡ اَحۡيَآءٌ وَّلٰـكِنۡ لَّا تَشۡعُرُوۡنَ (2:154) یہ مردہ نہیں۔ زندہ ہیں۔ لیکن تم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر اُس زندگی کی کنہ و حقیقت کو سمجھ نہیں سکتے۔ دوسری جگہ ہے: وَلَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِيۡنَ قُتِلُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ اَمۡوَاتًا ؕ بَلۡ اَحۡيَآءٌ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ يُرۡزَقُوۡنَ ۝۱۶۹ (3:169)۔ خدا کی راہ میں جان دینے والوں کے متعلق خیال تک بھی نہ کرو کہ وہ مردہ ہیں۔ وہ اپنے نشوونما دینے والے کے ہاں زندہ ہیں وہ انہیں سامانِ حیات عطا کرتا ہے۔

کھول کے کیا بیاں کروں سِرِّ مقامِ مرگ و عشق
عشق ہے مرگِ باشرف، مرگ حیاتِ بے شرف

یہی ہیں وہ بلند بخت، سعادت مند افراد جنہیں عرفِ عام میں شہید کہا جاتا ہے۔ اس لئے کہ جان دے کر اپنے ایمان کی زندہ شہادت پیش کرتے ہیں۔ یہ نظامِ خداوندی کے مبنی بر حق و صداقت ہونے کی شہادت دیتے ہیں۔ یہ اس فریضہ کی ادائیگی کو تکمیل تک پہنچا دیتے ہیں جس کی رُو سے اُمتِ مسلمہ کو شہداء علی الناس کہا گیا ہے۔ یعنی تمام اقوامِ عالم کے اعمالِ حیات کی محاسب و نگران۔ کتنا اہم تھا یہ فریضہ اور کس حسن و خوبی سے انہوں نے اسے ادا کیا۔

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

❁❁❁❁❁

ی تو پھر بھی خود مجاہدین کی شہادت کا تذکرہ ہے۔ قرآن کریم تو مجاہدین کے گھوڑوں کی تگ و نماز کو حق و صداقت کے لئے

بطور شہادت پیش کرتا ہے جب کہتا ہے کہ:

وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ﴿١﴾ فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ﴿٢﴾ فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ﴿٣﴾ فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ﴿٤﴾ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ﴿٥﴾

(100:1-5) شہادت دیتے ہیں وہ گھوڑے جو ہانپتے ہوئے یورش کرتے ہیں۔ جو پتھروں پر اس شدت سے پاؤں مارتے ہیں کہ ان سے آگ کی چنگاریاں اُڑتی ہیں۔ جو صبح سویرے دشمن کی فوجوں پر حملہ کرتے ہیں جن کے سموں کی ٹاپ سے گردو غبار اڑتا ہے۔ جو مردانہ وار دشمن کی صفوں کے اندر جا گھستے ہیں ❶ کہ یہ سب شہادت دیتے ہیں اس حقیقت کی کہ جب انسان وحی کی روشنی میں قدم نہ اٹھائے تو یہ بڑا ہی ناقدر شناس ہو جاتا ہے اور دنیا میں فساد برپا کرتا ہے جسے روکنے کے لئے مجاہدین کے گھوڑوں کو اس طرح یورش کرنی پڑتی ہے۔

پیٹھ موڑنے والا:

یہ تو ہیں مجاہدین کے سرفروشانہ کارنامے۔ اس شہادت گاہ الفت کے معاملات کس قدر نازک ہیں، اس کا اندازہ قرآن میں بیان کردہ ایک اور حقیقت سے لگایئے ذرا تصور میں لایئے اس منظر کو کہ بدر کا میدان ہے مومنین کی مٹھی بھر جماعت اپنا سب کچھ چھوڑ کر اللہ کی راہ میں جان دینے کے لئے دشمن کے سامنے آ کھڑی ہوئی ہے۔ یہ صحابۂ کبار رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی جماعت ہے۔ یہ ان السابقون الاولون کی جماعت ہے جنہیں خدا نے مومن حقا کہہ کر پکارا ہے۔ یہ وہ ہیں جن کے لئے جنت کی بشارت دی گئی ہے۔ میدانِ جنگ میں یہ دشمن کی صفوں پر برق خاطف بنکر گرنے کے لئے ایسے مضطرب و بیقرار کھڑے ہیں کہ ـــــ سینہ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا۔ عین اس وقت ان سے کہا جا رہا ہے کہ یاد رکھو۔ دشمن کو پیٹھ دکھا کر نہ بھاگ اٹھنا

وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَىِٕذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَاۗءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿١٦﴾ (8:16)۔ آج کے دن ان میں سے جو شخص دشمن کو پیٹھ دکھائے گا۔ بجز اس کے کہ وہ میدان میں پینترہ بدلنے کے لئے ہو یا اپنی جماعت کے ساتھ ملنے کے لئے، تو یاد رکھو۔ وہ خدا کے غضب کا مستحق ہو جائے گا اور سیدھا جہنم میں چلا جائے گا۔ اور تم جانتے ہو کہ جہنم کس قدر بُرا ٹھکانہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اُس جماعت میں کون ایسا ہو سکتا تھا جو دشمن کو پیٹھ دکھا کر بھاگ نکلتا۔ یہ تاکید تو میدانِ جہاد کی اہمیت کو اُجاگر کرنے کے لئے ہمارے آپ کے لئے ہے۔

یہ ہے جہاد کی عظمت اور اہمیت قرآنِ کریم کی رُو سے جہاد سے بڑھ کر کوئی اور حسنِ عمل نہیں۔ اور اس سے گریز کرنے والوں کا ٹھکانا جہنم کے علاوہ کوئی اور نہیں۔ یہی ماحصلِ دین ہے۔ یہی منتہائے ایمان ہے۔ یہی متاعِ حیات ہے۔

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کِشور کشائی

اب ظاہر ہے کہ اگر اس کے مقابلہ میں دنیا کی کوئی اور کشش زیادہ جاذب ہو جائے تو پھر ایمان باقی کہاں رہ سکتا ہے۔

❶ ان آیات کا ایک اور مفہوم بھی ہو سکتا ہے جسے میں مفہوم القرآن میں بیان کروں گا۔ (پرویزؒ)

دیکھئے! قرآنِ کریم نے اس عظیم حقیقت کو کس قدر واشگاف انداز میں بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ قُلْ سے رسول ﷺ! ان سے برملا کہہ دو کہ: اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ (9:24)۔ اگر تمہارے ماں باپ تمہارے بیٹے بیٹیاں۔ تمہارے بہن بھائی۔ تمہاری بیویاں۔ تمہارے دیگر افراد خاندان ___ وَاَمْوَالُ اقْتَرَفْتُمُوْهَا۔ یا تمہارا مال و دولت جسے تم محنت و مشقت سے کماتے ہو۔ وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا ۔۔۔ یا تمہارا کاروبار جس کے مندا پڑ جانے سے تم اس قدر خائف رہتے ہو۔ وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ۔ یا تمہارے مکانات اور محلات جو تمہیں اس قدر پسند ہیں۔ یاد رکھو! ان میں سے کوئی ایک چیز اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ تمہارے نزدیک خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم (نظامِ خداوندی) اور اس کے راستے میں جہاد کرنے سے زیادہ عزیز ہوگئی۔ فَتَرَبَّصُوْا ۔۔ تو تم انتظار کرو۔ حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ تا آنکہ خدا کا فیصلہ تمہارے خلاف آجائے۔ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ (9:24)۔ ایسی قوم جو سیدھی راہ کو چھوڑ کر غلط راہوں پر چل نکلے، اسے کامیابی کی راہ کس طرح دکھائی دے سکتی ہے۔

یہ ہے برادرانِ عزیز! جہاد سے گریز کرنے والی قوم کا مآل اور انجام!

جنگ کے سلسلہ میں قرآنِ کریم کسی قسم کے احکام اور ہدایات دیتا ہے ___ معاہدات کا احترام کس قدر ضروری ہے۔ دشمن کے ساتھ صلح کرنے کی کس قدر تاکید ہے۔ دشمن کے معاملہ میں بھی عدل اور انصاف کے اصولوں پر کار آمد رہنا کس قدر ضروری ہے۔ جو تمہاری پناہ میں آجائے اسے کس طرح اپنی حفاظت میں، اس کے مامن تک پہنچانا چاہئے۔ جنگ کے قیدیوں کو فدیہ لے کر یا بطورِ احسان چھوڑ دینا چاہئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ موضوع الگ ہے جس کی طرف میں اس وقت نہیں جانا چاہتا۔ اس وقت صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ قرآنِ کریم کن حالات میں جنگ کی اجازت دیتا ہے اور کن حالات میں اس کی تاکید کرتا ہے۔ جو کچھ بیان ہو چکا ہے اس کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے۔

1۔ اُس خطۂ زمین کی حفاظت کے لئے جنگ کی اجازت ہے جو نظامِ خداوندی کی عملی تشکیل کا ذریعہ ہو۔ اور

2۔ ظلم و استبداد کی روک تھام کے لئے جنگ کی تاکید ہے، وہ خواہ کہیں بھی ہو مظلوم کی آواز پر لبیک کہنا مسلمان کا اولین فریضہ ہے۔

موجودہ حالات:

ان حقائق کی روشنی میں اب ان حالات پر غور کیجئے جو ہندوستان کی طرف سے گذشتہ سترہ اٹھارہ برس میں مسلسل اور پیہم پیدا کئے جا رہے تھے۔ اور جو اب اپنی انتہا تک پہنچ چکے ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ پاکستان میں ہنوز قرآنی نظام قائم نہیں ہوا لیکن اس خطۂ زمین کو حاصل ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ یہاں نظامِ خداوندی قائم کیا جائے۔ یہی پاکستان کے مطالبہ کی بنیا تھی اور اس بنیاد پر ہمارے دعویٰ کی عمارت استوار ہوئی تھی۔ اسی کے لئے ہم نے اسے حاصل کیا تھا اور یہی ہمارا منتہا و مقصود ہے۔ جس طرح ایک مقصد اور منتہیٰ کی حفاظت ضروری ہوتی ہے۔

اسی طرح اس مقصد کے حصول کے ذرائع کی حفاظت ضروری ہوتی ہے۔ یوں سمجھئے کہ یہ ایک خطۂ زمین ہے جسے مسجد بنانے کے لئے حاصل کیا گیا ہے ظاہر ہے کہ اگر یہ خطۂ زمین ہی محفوظ نہ رہے تو ''مسجد'' کہاں تعمیر ہو سکے گی۔ سرزمین پاکستان کی اس وقت مثال وہی ہے جو ہجرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے فوری بعد سرزمین مدینہ کی تھی کہ وہاں ہنوز نظامِ خداوندی متشکل نہیں ہوا تھا لیکن وہ اس نظام کی تشکیل کا ذریعہ بننے والی تھی۔ لہٰذا برادرانِ عزیز! میری بصیرتِ قرآن کے مطابق سرزمینِ پاکستان کی حفاظت ہمارے لئے جزوِ ایمان ہے۔ ہندو نے پہلے دن سے نظریۂ پاکستان کی مخالفت کی۔ اور یہ اس کی مخالفت کے علی الرغم وجود میں آ گیا۔ وجود میں تو یہ آ گیا لیکن ہندو نے اسے دل سے کبھی قبول نہیں کیا۔ اس کی شدید آرزو یہ ہے (خدانہ کردہ) اس کے جداگانہ ''آزاد'' وجود کو ختم کر کے اسے پھر سے بھارت کا جزو بنا لیا جائے۔ اس کے لئے وہ مسلسل مصروفِ کوشش ہے اور اب اس مسئلہ کو اس نے انتہا تک پہنچا دیا ہے۔

جہاں تک ظلم اور زیادتی کا تعلق ہے، گذشتہ اٹھارہ برس میں، ہندوستان نے، مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کرنے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ صرف ان کے اس جرم کی پاداش میں کہ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ۔۔۔ وہ خدا کو اپنا رب کیوں مانتے ہیں۔ وہ مظلوم و ناتواں، پکار پکار کر خدا سے کہہ رہے ہیں کہ ہماری مدد کے لئے کسی کو بھیج۔ ان حالات میں مسلمانوں پر فریضہ عائد ہو جاتا ہے کہ ہندوؤں کے اس ظلم و ستم کی روک تھام کریں۔

جہاد فی سبیل اللہ:

ہندوستان سے جنگ کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ، ہماری حکومت کا ہے۔ وہ حالات کے مطابق جو فیصلہ بھی کرے وہی فیصلہ درست ہو گا۔ لیکن اگر وہ جنگ کرنے کا فیصلہ کرے، تو یہ جنگ یقیناً جہاد فی سبیل اللہ ہو گی۔ اور اس میں جان دینا شہادت۔ موجودہ عسکری نظام کے مطابق میدانِ جنگ میں فوجیں ہی جاتی ہیں۔ ہر ایک نہیں جا سکتا۔ لیکن شہری آبادی بھی اس جہاد میں برابر کا حصہ لے سکتی ہے۔ قرآنِ کریم نے مال اور جان دونوں سے جہاد کا حکم دیا ہے۔ اگر ہمارے سپاہی (یا قومی رضاکار) جان سے جہاد کرنے کے لئے نکلتے ہیں تو شہری آبادی کے لئے مال سے جہاد کرنا لازم آ جاتا ہے۔ علاوہ ازیں فوج کی کامیابی کا انحصار خود شہری آبادی کے (MORALE) پر ہوتا ہے۔ شہری آبادی جس قدر ہمت اور استقلال کا ثبوت دے گی اور جس قدر امن و سکون سے رہے گی، فوج کے لئے کامیابی حاصل کرنا اتنا ہی آسان ہو جائے گا۔ ملک کے لئے دشمن کا حملہ اس قدر پریشان کن نہیں ہوتا جس قدر پریشان کن اور مصائب آفریں، شہری آبادی کا انتشار اور گھبراہٹ ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰہِ ؕ وَ الَّذِیۡنَ مَعَہٗۤ (48:29) کی جو دو خصوصیات بیان کی ہیں کہ ـــــ اَشِدَّآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیۡنَہُمۡ (48:29)۔ تو ان کا مظاہرہ زمانہ امن کے مقابلہ میں زمانہ جنگ میں اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے فوج اگر اَشِدَّآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ ۔۔۔ کا مظاہر کرتی ہے تو شہری آبادی کو رُحَمَآءُ بَیۡنَہُمۡ کی مظہر ہونا چاہئے۔ یعنی تمام باہمی اختلافات اور نزاعات کو یکسر بالائے طاق رکھ کر کامل محبت اور یک جہتی سے پرسکون رہنا اور نہایت ہمت اور استقلال سے تمام مشکلات کا مقابلہ کرنا۔ شہری آبادی اس جہاد میں اس انداز سے حصہ لے سکتی ہے۔ انہی کے لئے کہا گیا ہے کہ: وَلَا تَنَازَعُوۡا فَتَفۡشَلُوۡا

وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ (8:46) باہمی جھگڑے مت پیدا کرو۔ ایسا کرو گے تو تم بزدل بن جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ لہٰذا تم استقامت اور ثبات سے رہو۔ یاد رکھو۔ خدا ایسے ہی لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

فوج کے پاس اگر سامانِ حرب وضرب کی کمی بھی ہو تو ان کی قوتِ ایمانی اس کمی کو پورا کر دیتی ہے۔ اس لئے قرآنِ کریم نے جماعتِ مومنین کے لئے کہا ہے کہ ان میں کا ایک ایک مجاہد دشمن کے دس دس سپاہیوں پر غالب آ سکتا ہے (8:65) اور اپنے سے دگنی فوج پر تو یہ غالب بہر حال رہتے ہیں (8:66) یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

یہی قوتِ ایمان، غیر محارب (شہری) آبادی کے دل میں وہ کوہ آسا ہمت پیدا کر سکتی ہے جس سے ہر مشکل کا مقابلہ نہایت ثبات واستقامت سے ہو جاتا ہے۔

یہ ہے وہ فریضہ جو موجودہ حالات میں ہم (اہلِ پاکستان) پر عائد ہوتا ہے۔ اگر ہم نے اس فریضہ کی ادائیگی میں ذرا سی بھی کوتاہی کی تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اسے بھی قرآنِ کریم کے الفاظ میں سُن لیجئے۔ وہ کہتا ہے کہ:

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاۗصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ (8:25)

اس تباہی سے بچو کہ جب وہ آ جائے تو پھر انہی تک محدود نہیں رہا کرتی جنہوں نے ظلم اور زیادتی کی ہو۔ اس کے شعلے سارے معاشرہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتے ہیں اور پھر حالت یہ ہو جاتی ہے کہ

نہ کہ را منزلت باشد نہ مہ را

اور یہ خدا کے اس قانونِ مکافات کی رُو سے ہوتا ہے، جس کا تعلق انسانوں کی ہیئت اجتماعیہ سے ہے۔ اور یہ قانون اپنی گرفت کے لحاظ سے بڑا اشدید واقعہ ہوا ہے۔

حذَر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

یہ ہے برادرانِ عزیز! فطرت کا اٹل اصول۔ اس کی رُو سے زندہ وہی رہ سکتا ہے جو مرنا جانتا ہے۔ اس کے بغیر انسان کا ہر دعویٰ باطل اور ہر اعتقاد جھوٹا ہوتا ہے۔

بے جُرأتِ رِندانہ ہر عشق ہے رُوباہی
بازُو ہے قوی جس کا، وہ عشق یدُاللّٰہی

مجھے یقین ہے کہ وقت آنے پر ہم اس امتحان میں پورے اتریں گے۔ خوش بخت ہیں وہ افراد جنہیں ایسے مواقع میسر آ جائیں جن میں جنت انہیں پکار پکار کر بلا رہی ہو اور خدا کی رحمت ان کی طرف ہجوم کر کے آ رہی ہو۔

اُولٰۗىِٕكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۣ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۝ (2:157)

علامہ غلام احمد پرویز علیہ الرحمۃ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورۃ الذّٰریٰت آیات 24 تا 46

درسِ قرآن

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ﴿۲۴﴾ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ط قَالَ سَلٰمٌ ۚ قَوْمٌ
مُّنْكَرُوْنَ ﴿۲۵﴾ فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ ﴿۲۶﴾ فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۲۷﴾ فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ
خِيْفَةً ط قَالُوْا لَا تَخَفْ ط وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴿۲۸﴾ فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ
عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ ﴿۲۹﴾ قَالُوْا كَذٰلِكِ ۙ قَالَ رَبُّكِ ط اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۰﴾ قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا
الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۳۲﴾ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ﴿۳۳﴾ مُّسَوَّمَةً
عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۴﴾ فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳۵﴾ فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ
الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۳۶﴾ وَتَرَكْنَا فِيْهَآ اٰيَةً لِّلَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۳۷﴾ وَفِيْ مُوْسٰٓى اِذْ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى
فِرْعَوْنَ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۸﴾ فَتَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ وَقَالَ سٰحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ﴿۳۹﴾ فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِى
الْيَمِّ وَهُوَ مُلِيْمٌ ﴿۴۰﴾ وَفِيْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ ﴿۴۱﴾ مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ اَتَتْ عَلَيْهِ اِلَّا
جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيْمِ ﴿۴۲﴾ وَفِيْ ثَمُوْدَ اِذْ قِيْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۴۳﴾ فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ فَاَخَذَتْهُمُ
الصّٰعِقَةُ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ﴿۴۴﴾ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِيَامٍ وَّمَا كَانُوْا مُنْتَصِرِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ط
اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۴۶﴾

عزیزانِ من! آج اگست 1982ء کی 20 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الذّٰریٰت کی آیت 24 سے ہو رہا ہے: (51:24)۔ کبھی ہمارے شاعر کہا کرتے تھے کہ انسانوں کی قسمت افلاک کے تابع چلتی ہے:

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاء [1]

ہمارے ہاں کوئی بھی انقلاب آیا ہے تو نظر آتا ہے کہ یہ آسمان ہم انسانوں کی روش کے تابع نہیں چلتا' جیسے اسے ہمارا کچھ پتہ ہی نہیں ہے۔ یہ افلاک اب کیا ہیں اور کھڑی پل کے بعد کیا ہو جائیں گے' ان کا پتہ نہیں چلتا' مثلاً اب آسمان کا بھی پتہ نہیں' گھنٹہ بھر پہلے جس زور سے یہاں بارش ہو رہی تھی' ہمارا خیال تھا کہ آج شاید درس کا ناغہ کرنا پڑے' اور اب دھوپ کی وجہ

[1] اس کا دوسرا مصرع ہے: جسے دیکھو یہی کہتا ہے ہم بیزار بیٹھے ہیں۔

سے شامیانے لگانے پڑ رہے ہیں' تو ہمارا مزاج بہت طاقتور ہے۔ یہ آسمان تک کو متاثر کیے جا رہا ہے۔ عزیزانِ من! درس کا جیسے میں نے عرض کیا ہے' آغاز آیت 24 سے ہو رہا ہے۔ یہ سورۃ 51 ویں ہے۔

قرآنِ حکیم مکافاتِ عمل کے قانون کی متعین طور پر بار بار وضاحت پیش کرتا ہے اور جنسی بدنہادی کی بھی

سابقہ آیات میں قرآنِ حکیم کا جو انداز ہے' وہ ساری بات قرآنی تعلیم میں نکتے کی ہے۔ وہ قانونِ مکافاتِ عمل ہے: انسان کے ہر عمل کا ایک متعین نتیجہ ہوتا ہے اور اسے ہی وہ بہ دلائل وشواہد سمجھاتا چلا جاتا ہے۔ سابقہ آیات میں اس نے خارجی کائنات کے مختلف شواہد پیش کیے کہ تم دیکھو کہ کس طرح ایک خاص عمل اسی قسم کا متعین نتیجہ مرتب کرتا ہے اور پھر جیسا کہ اس کا انداز ہے' یہ تو دلائل تھے۔ اب وہ اقوامِ سابقہ کی داستانوں کو' ان کے مآل اور انجام کے' شواہد کو پیش کرتا ہے۔ جیسا کہ قریب قریب ہر درس میں یہ دہرایا جاتا ہے' یہ داستانیں کوئی تاریخ کے نصاب کے طور پر پیش نہیں کی جاتیں۔ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ فلاں قوم نے اس قسم کا نظام قائم کیا' اس قسم کی روش اختیار کی' اس کا یہ نتیجہ نکلا' جب اور جہاں بھی کوئی قوم اسی قسم کی روش اختیار کرے گی اور ایسا ہی نظام قائم کرے گی' اس کا نتیجہ بھی یہی نکلے گا۔ یہ ہے مقصود ان داستانوں کے بار بار دہرانے کا کہ تم دیکھو کہ تم کس روش پہ چل رہے ہو' تمہارا نظام کیسا ہے' اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی' ہم کسی کی خاطر اپنی روش کو نہیں بدلیں گے: وَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحۡوِيۡلًا (35:43)۔ یہ ہے مقصد ان داستانوں کے دہرانے کا۔

خارجی کائنات کے دلائل پیش کرنے کے بعد پھر قرآن کریم نے تاریخی شواہد پیش کیے ہیں۔ آنے والی چند آیات کے اندر قریباً قریباً یہ جتنے بھی اقوامِ سابقہ کا ذکر قرآن حکیم میں مختلف مقامات پر آیا ہے' وہ ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چلا گیا ہے یعنی ان آیات میں زیادہ تفصیل نہیں بیان کی گئی کیونکہ ان کی تفاصیل تو مختلف مقامات پر اس نے بڑی شرح و بسط سے بیان کی ہوئی ہیں۔ ان کو یکجا کیا جائے تو وہ ہر ایک قوم کی پوری مسلسل تاریخ بن جاتی ہے۔ دوسرے مقامات پر وہ صرف کچھ اشارہ کرتے ہوئے آگے چلا جاتا ہے۔ بات وہ قومِ لوط سے شروع کرتا ہے۔ وہ جو ان کے ہاں جنسی بدنہادی Sex Perversion تھی' میں اسے اشارے میں ہی بات کروں گا۔ قرآن حکیم نے کہا ہے کہ یہ چیز انفرادی نہیں ہوتی کہ اس تقاضے کی' جس طرح سے جی چاہے' تسکین کر لی جائے' اس کے لیے حدود مقرر ہیں۔ جو حدود فراموش قوم ہے' وہ بالآخر تباہ ہو کر رہتی ہے۔

حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی باہمی ملاقات کا تذکرہ اور صاحبِ علم بیٹے کی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خوشخبری

جہاں بھی قومِ لوط کا ذکر آیا ہے' اس کی ابتدا قرآنِ کریم میں حضرتِ ابراہیم کے واقعہ سے ہی کی ہے کہ وہ راستے میں پڑتے تھے اور یہ جو حضرتِ لوط علیہ السلام کی طرف خدا کے فرستادہ گئے تھے' وہ پہلے حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کو مل کر آگے پہنچے تھے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے جب اپنے وطن سے ہجرت کی ہے تو ان کے ساتھ حضرتِ لوطؑ بھی آئے تھے' وہ ایمان لے آئے ہوئے تھے اور ابھی نبوت سے سرفراز نہیں ہوئے تھے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ وہ آپ علیہ السلام کے بھتیجے تھے اور وہ آپ علیہ السلام کے ساتھ ہی آئے۔ یہ جسے آج ہم Dead Sea (بحرِ منجمد) کہتے ہیں' یہ تمام اقوام فلسطین کے علاقوں کے گردوپیش ہی تھیں اور وہاں تمام انبیائے کرام آئے تھے' اور حضرتِ ابراہیم علیہ السلام' فلسطین کے ان علاقوں میں' جو شام کے ساتھ ملتا ہے' Settle (سکونت پذیر) ہو گئے یا یوں کہیے کہ شام کے علاقوں کے اندر رہائش پذیر تھے۔ وہاں سے اپنے ایک بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو' انہوں نے حجاز میں بسایا اور یہاں انہوں نے بیت اللہ کی بنیاد رکھی تو یہ کھنڈرات راستے میں پڑتے تھے۔

یہ اس دور کا ذکر ہے جب حضرتِ لوط علیہ السلام نبوت سے سرفراز ہو چکے تھے اور حضرتِ ابراہیم علیہ السلام' ادھر شام کے علاقے میں تھے۔ قرآن کریم یوں ذکر کرتا ہے کہ اس کے فرستادہ' جو حضرتِ لوط علیہ السلام کی طرف گئے تھے' وہ راستے میں حضرتِ ابراہیم علیہ السلام سے ملتے ہوئے گئے اور اس کے لیے بھی یونہی راستے میں وہ ملتے ہوئے نہیں گئے۔ ان کے ذمے ایک اہم فریضہ تھا' ایک خوشخبری تھی جو حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کو دینی تھی۔ کہا کہ: هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ﴿۲۴﴾ (51:24) اے رسول! کیا تمہیں ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں کا جو بڑے ہی معزز تھے' کا ذکر بھی معلوم ہے؟ ان کے متعلق قرآن حکیم کا بات بیان کرنے کا یہ انداز ہے۔ کہا کہ: اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ۭ قَالَ سَلٰمٌ ۚ (51:25) قرآنِ کریم کی تعلیم کا انداز اور ملخص یہی ہے کہ ہر انسان دوسرے انسان کی سلامتی کا خواہاں ہو' اور سلماً بڑا ہی جامع لفظ ہے' اس میں ایک طرف حفاظت (Protection) امن ہے اور دوسری چیز صلاحیتوں کی نشوونما اور برومندی ہے' ان صلاحیتوں کو تکمیل تک پہنچانا ہے۔ ایک لفظ کے اندر یہ دونوں معنی آ جاتے ہیں اور اس کے علاوہ بھی معنی ہیں۔ قرآن حمید نے انبیائے کرامؑ کے متعلق بھی کہا' خدا بھی ان کو سَلٰمٌ علیہ کہتا ہے' وہ آپس میں بھی یہی کہتے ہیں' وہ جو دوسرے افراد سے ملتے ہیں' وہ بھی یہی کہتے ہیں' ہمیں بھی یہی سکھایا گیا ہے کہ جب ملیے تو کہیے: السلام علیکم! یہ بڑی جامع چیز ہے اور اُدھر سے جواب آتا ہے: وعلیکم السلام۔ اور اب ہماری ہر زندگی کی طرح یہ بھی ایک رسم بن کر رہ گئی ہے۔ اب تو سلام علیکم کہتے ہیں تاکہ ذرا قریب آئے تو میں جلدی سے گلا گھونٹ سکوں۔ ''جب وہ آئے تو انہوں نے سَلٰمٌ کہا' انہوں نے جواب میں بھی کہا سَلٰمٌ''۔

عزیزانِ من! آگے آیا ہے کہ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿۲۵﴾ (51:25) وہ کوئی جانے پہچانے ہوئے لوگ نہیں تھے' اجنبی تھے حضرت ابراہیمؑ پہچان نہیں سکے کہ کون ہیں لیکن پہچانے نہ بھی جائیں بہرحال مہمان تو تھے' اجنبی بھی مہمان تھے اور وہ انہیں کچھ اوپرے سے معلوم ہوئے۔ کہا ہے کہ: فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ فَجَاۗءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ ﴿۲۶﴾ (51:26) چنانچہ وہ گھر میں گئے اور وہاں سے اس زمانے کی جو ضیافت تھی' جو دعوت تھی' وہ گوشت پہ ہی ان لوگوں کا گزارا تھا اور بہترین ضیافت گوشت کی ہی ہوتی تھی۔ وہ گھر میں گئے اور ایک بچھڑے کا بھنا ہوا گوشت لے کر آ گئے۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ: فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۲۷﴾ (51:27) وہ ان کو پیش کیا کہ کھائیے اور انہوں نے نہ کر دی کہ نہیں شکریہ! ہم نہیں کھاتے۔ تو یہ جو ان کا انداز تھا'

اس سے انہیں کوئی ایسا احساس ہوا کہ انہوں نے کچھ یگانگت کا ثبوت نہیں دیا' مہمان بن کر آئے تھے تو مہمان کا تو طریقہ یہ تھا' کہ کچھ تھوڑی سی یگانگت ہوتی۔ تو یہ ایسا کیوں ہے؟ انہوں نے اس انداز سے ایسا ردِعمل کیوں ظاہر کیا ہے؟ اس لیے انہیں کچھ اس کا احساس پیدا ہوا۔ آگے کہا ہے کہ: فَاَوۡجَسَ مِنۡهُمۡ خِيۡفَةً ؕ قَالُوۡا لَا تَخَفۡ ؕ (51:28) وہ بھی اندازے سے پہچان گئے کہ ان کو کچھ تردد ہوا ہے۔ کہا کہ کچھ تردد کی بات نہیں ہے' کہ جی! سیدھی سی بات ہے کہ ہمیں بھوک نہیں ہے' تردد کی بات نہیں ہے۔ ہم دشمن نہیں' دوست ہیں۔ ہم خدا کے رسول ہیں اور اس کی طرف سے کہا کہ: وَبَشَّرُوۡهُ بِغُلٰمٍ عَلِيۡمٍ ﴿۲۸﴾ (51:28) ہم تمہیں ایک ایسے بیٹے کی خوشخبری دیتے ہیں جو بڑا صاحبِ علم ہوگا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بڑھاپے کی عمر میں اولاد کی خبر کوئی معجزہ نہ تھا

عزیزانِ من! حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے متعلق قرآن حمید میں دوسرے مقام پہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اچھی خاصی' بڑھاپے تک کی عمر آ گئی ہوئی تھی اور ابھی ان کے ہاں اولاد نہیں ہوئی تھی اور یہ بھی ہے کہ اگر پہلا بیٹا حضرتِ اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوا تھا تو اس کے چودہ سال بعد تک پھر دوسرا بیٹا نہیں پیدا ہوا۔ حضرتِ اسحاق علیہ السلام دوسرے بیٹے تھے اور وہ چودہ سال بعد پیدا ہوئے تھے۔ ممکن ہے یہ کچھ ناامیدی کی چیز بھی ہو۔ جو بھی صورت ہو تو انہوں نے ایک لڑکے کی بشارت دی اور کہا کہ وہ عَلِيۡمٍ (51:28) ہوگا یعنی وہ بیٹا بھی بہت صاحبِ علم ہوگا فَاَقۡبَلَتِ امۡرَاَتُهٗ فِىۡ صَرَّةٍ فَصَكَّتۡ وَجۡهَهَا وَقَالَتۡ عَجُوۡزٌ عَقِيۡمٌ (51:29) بیوی نے سنا تو اس نے جیسے کہتے ہیں کہ ہائے میری توبہ! اس بڑھاپے کے اندر اولاد کی بات تم کر رہے ہو؟ کیا کہہ رہے ہو؟ یعنی جیسے عام طور پہ یہ کہتا ہے کہ یہ تو کچھ شرم کی سی بات ہے۔ اسی پچاسی سال کا یہ بوڑھا' میں ستر پچھتر سال کی بوڑھی اور تم میرے متعلق کہہ رہے ہو کہ میرے ہاں اولاد ہوگی! کیا کہہ رہے ہو؟ آگے کہا ہے کہ: قَالُوۡا كَذٰلِكِ ۙ قَالَ رَبُّكِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الۡحَكِيۡمُ الۡعَلِيۡمُ ﴿۳۰﴾ (51:30) انہوں نے کہا کہ یہ بات ہم اپنی طرف سے نہیں کہتے' یہ تو ایک پیغامِ خداوندی تھا جو ہم تم تک پہنچا رہے ہیں اور جب اس خدا نے یہ بات کہی ہے تو بہرحال یہ تو ایسے ہو کر رہے گی۔ یہاں دو الفاظ آئے ہیں۔ کہا ہے کہ هُوَ الۡحَكِيۡمُ الۡعَلِيۡمُ ﴿۳۰﴾ (51:30) یہ ہیں مقام جہاں قرآن حمید کے لیے کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ یہ جواب کہ اس بڑھاپے میں بھی اولاد ہو رہی ہے تو یہ کوئی معجزہ نہیں ہے۔ معجزے میں حکمت کا تعلق ہی نہیں ہوتا۔ جو معجزے کا تصور ہے' وہ تو یہ ہے کہ یہ جتنے قاعدے قانون عام ہوتے ہیں' ان کو عاجز کرتا ہوا ایک واقعہ سرزد ہوتا ہے۔ معجزہ کے تو معنی ہی عقل کا عاجز آ جانا ہے کہ عقل سمجھ ہی نہ سکے کہ کیسے ہو گیا تو جو چیز ایسی ہو' اس میں دلائل اور حکمت کا کیا تعلق! خدا کے حکیم ہونے کا کیا تعلق! وہ علیم ہے' وہ جانتا ہے کہ اولاد کیوں نہیں ہو رہی' وہ حکیم ہے کہ یہ ایک ایسی چیز ہے جو حکمت کی رو سے ہو جائے گی ورنہ یہ ہونا چاہیے کہ خدا اس پہ قادر ہے' جو چاہے کر سکتا ہے۔ مگر یہ نہیں کہا۔

بڑھاپے کی عمر میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کو اولاد کی بشارت کے سلسلہ میں آپ کی بیوی کا اسی قسم کا ذکر میں نے عرض کیا ہے کہ قرآنِ کریم کس طرح سے یہاں یہ چیز سمجھا جاتا ہے اور یہ بات دوسرے مقام پہ آ چکی ہے۔ اسی

قسم کا واقعہ حضرت ذکریاؑ کے ساتھ پیش آیا تھا۔ ان کے ہاں بھی اولاد نہیں تھی، کبر سنی بھی تھی، انہیں بھی اسی طرح سے بشارت دی گئی، ان کا بھی ردِ عمل یہی تھا اور وہاں بھی یہی چیز تھی کہ حکمت سے کام لیا۔ اب آج کل کی اصطلاح میں واقعی حکمت اس کو کہتے ہیں۔ بہر حال حکمت کا لفظ یا حکیم کا لفظ وہاں آتا ہے جہاں قاعدے قانون کے مطابق کوئی بات ہوتی ہے۔ وہاں قرآن حمید نے کیا کہا تھا؟ یہ کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش کیسے ہوئی۔ کہا کہ: وَاَصۡلَحۡنَا لَهٗ زَوۡجَهٗ ط (21:90) ان کی بیوی میں کوئی ایسا نقص تھا، بیماری تھی جس کی وجہ سے استقرارِ حمل نہیں ہو رہا تھا، اس کی اصلاح ہو گئی۔ کیا بات ہے! یہ قرآن حکیم ہے، ایک لفظ میں ساری گتھیاں سلجھا جاتا ہے۔ کہا ہے کہ وَاَصۡلَحۡنَا (21:90) تو ٹھیک تھا کہ اس کی اصلاح ہو گئی۔ وہاں لَهٗ (21:90) ہے۔ خاوند میں کوئی نقص نہیں تھا اس کے لیے وہ اس قابل ہو گئی کہ استقرارِ حمل ہو جائے۔ یہ ہے وَاَصۡلَحۡنَا لَهٗ (21:90)۔ اب نظر آتا ہے کہ اس میں کوئی معجزے والی بات نہیں ہے۔ کہا ہے کہ ''اس کی اصلاح کر دی گئی، اس میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی''۔ خاوند تو ٹھیک ہی تھا، بھلا چنگا تھا: ''لَهٗ'' تو اس طرح سے اولاد پیدا ہو گئی اور یہاں بھی قرآنِ کریم میں حکیم العلیم کہا ہے۔ تو یہ اسی انداز کی کوئی چیز ہے۔ جیسے بھی ہے تفصیل تو قرآن حکیم نے نہیں دی لیکن خود یہ چیز بتا رہی ہے کہ جیسے حضرتِ ذکریا علیہ السلام کے ضمن میں واقع ہوا تھا، یہ بھی کچھ اس قسم کی چیز ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حضور کچھ فرشتوں کا کھانا کھانے کی روایات کا ماجرا اور تفسیروں میں کی جانے والی لاحاصل بحثوں کا معیار

عزیزانِ من! میں آگے بڑھنے سے پیشتر یہ عرض کر دوں کہ ہمارے ہاں بحثیں چلی ہوئی ہیں، اول تو یہی بحث چلی ہوئی ہے کہ وہ اولاد کیسے پیدا ہو گئی اور پھر یہ بحثیں چلی ہوئی ہیں کہ یہ آنے والے کون ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ وہ فرشتے تھے، ملائکہ تھے۔ اب یہ جو کہنے والے ہیں ان کے متعلق تو حیرت ہے کہ ہزار برس سے ہمارے ہاں یہ بات چلی آ رہی ہے کہ وہ فرشتے تھے، انسان کی شکل میں آئے، حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے ان کے سامنے کھانا پیش کیا، انہوں نے کھانے سے انکار کیا، تو انسان کی شکل کے اندر آئے۔ کہا گیا کہ انہوں نے اس لیے انکار کیا تھا کہ وہ فرشتے تھے، فرشتے کھانا نہیں کھاتے، یعنی فرشتے انسان کی شکل میں تو آ جاتے ہیں لیکن کھانا نہیں کھاتے۔ اس میں تو کسی دلیل دینے کی ضرورت ہی نہیں، قرآن حکیم نے دیگر مقامات پر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہؓ سے ملائکہ کے متعلق خود کہا ہے کہ وہ نظر نہیں آیا کرتے۔ مجھے تو عزیزانِ من! حیرت ہوتی ہے ان چیزوں سے کہ اتنی لمبی چوڑی بحثیں ہیں، یہ صرف اس لیے ہے کہ ان کے سامنے قرآن حکیم نہیں ہے، وہ قرآن حکیم کی طرف نہیں جاتے ہیں۔

قرآن حکیم کی تفسیر لکھی جا رہی ہے اور قرآن حکیم کے اس مقام کو کوئی سامنے نہیں لایا جب کہ قرآن حکیم نے کہا ہے کہ ملائکہ نظر نہیں آیا کرتے اور بحثیں جاری ہیں کہ صاحب! وہ کون تھے، کس شکل میں تھے، کیوں آئے تھے، انسان تھے تو انسانوں کی کیسی شکل تھی؟ یہ بحثیں چلی ہوئی ہیں۔ پہلے تو عزیزانِ من! یہ سوچیے کہ دین سے اس سوال کا کیا تعلق ہے کہ وہ کون

تھے، آج ہم سے اس کا واسطہ کیا ہے کہ وہ کون تھے۔ قرآنِ کریم نے ان کو مرسلین کہا ہے، رُسل کہا ہے، جسے خدا کے فرستادہ کہتے ہیں، وہ بھیجے ہوئے تھے، قاصد تھے۔ رسول کا لفظ تو آتا ہی قاصد کے لیے ہے اور رسول، قرآن کریم نے کہا ہے کہ وہ ہمیشہ انسان ہوتے تھے، بشر ہوتے تھے تو ٹھیک ہے کوئی بشر تھے۔ اب یہ بیٹھ کر کیا متعین کرنا اور پھر متعین کرنے کے لیے بحثوں میں پڑ جانا کہ وہ کون تھے، بشر نہیں ہو سکتے تھے کہ انہوں نے یہ بشارت اپنی طرف سے کی، خدا نے نہیں دیکھا کہ انہوں نے یہ کہا تھا کہ خدا کا پیغام تم تک پہنچا رہے ہیں، اپنی طرف سے بشارت نہیں کی تھی، ملائکہ تھے۔ اب بحث شروع ہوگئی کہ ملائکہ بشکل انسانی آسکتے ہیں کہ نہیں؟ چل بھئی! چلے ہوئے ہیں، کتابوں پہ کتابیں لکھی جا رہی ہیں، تفسیروں پہ تفسیریں لکھی جا رہی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر آپ یہ چیز مان لیں تو اس کے دین پر، اس کے ایمان پر، ہماری زندگی پر، کیا فرق پڑا۔

ہم تو ہزار برس سے Out of the Text (نصاب سے باہر) سوالوں کا حل تلاش کرنے میں مصروف ہیں: ویلی جُٹی اُن ویلے

قرآن کریم تو آیا ہی زندگیاں سنوارنے کے لیے ہے، انسان کو صحیح نظام دینے کے لیے ہے، کتنی بحثوں کے بعد اگر کسی نے یہ چیز مان بھی لی تو اس سے کیا فرق پڑا۔ ہمارا ایمان یہ ہے کہ خدا نے کہا ہے۔ وہ ہمارے فرستادہ تھے، بھیجے ہوئے تھے، پیغامبر تھے وہ گئے تھے۔ اللہ اللہ خیر سلا، اس سے زیادہ تو وہ پوچھے گا ہی نہیں صاحب! اور قرآن کریم کہتا ہے کہ ان چیزوں کے متعلق تم سے پوچھیں گے ہی نہیں، مگر یہ کہتے ہیں کہ صاحب! اس کا کیا اعتبار کہ لڑکوں کو امتحان میں Questions (سوالات) Out of the Text (نصاب کے باہر سے) بھی تو آجاتے ہیں پھر اس کے بعد Agitation (شورش) ہوتی ہیں۔ یہ اس لیے کہتے ہیں کہ اگر وہ یہ پوچھ بیٹھے تو ہمیں اپنی طرف سے تو تیاری کر کے جانا چاہیے تو جناب! جواب دینے کی یہ تیاری ہو رہی ہے۔

عزیزانِ من! آج ہم اس چیز کو کچھ تھوڑا سا مذاق کے طور پہ ہی لیتے ہیں کہ پھر ہزار برس تک یہ ہوتا کیا رہا ہے؟ بات بڑی سہل ہے۔ یہ ملوکیت کا نتیجہ تھا کہ جتنے معاملات تھے وہ تو سارے بادشاہ نے اپنے ہاتھ میں رکھ لیے، انہیں مذہبی پیشواؤں کے گروپ کو ساتھ رکھنے کی ضرورت تھی، یہ بڑا کام دیتے ہیں، ساتھ میں ان کو رکھ لیا، وظائف لگ گئے، کھانے کو مل گیا۔ اب یہ کیا کریں؟ فیر او ہی پنجابی دا محاورہ کواں (پھر میں وہی پنجابی زبان کا محاورہ کہوں) کہ، ویلی جُٹی اون ویلے، انہاں نوں دیتا چھوٹا جیا ویلنا۔ ہن کپاس تے کوئی ویلے، اے اون ویلدے رئے ہزار برس (کام نہ کاج، فارغ جُٹی تو اون بیلے۔ انہوں نے انہیں ایک چھوٹا سا بیلنا تھما دیا۔ اب کپاس تو بیلے (کہ بنولہ الگ ہو جائے) مگر یہ ہیں کہ ہزار برس سے اون ہی بیل رہے ہیں)۔ یہ آپ کے ہاں کتابوں سے لائبریریوں پہ لائبریریاں بھری ہوئی ہیں۔ عزیزانِ من! یہ ختم ہی نہیں ہوتیں، یہ اس ہزار برس میں اتنی ہیں اور ان میں دیکھو کہ وہ سارا کچھ جو ہے، اک وڑیواں نظر نئیں کتے اوندا ساری اون ای ویلی ہوئی ہسگی (مگر کہیں دانے کا ایک بنولہ بھی نظر نہیں۔ انہوں نے ساری اون ہی بیلی ہوئی ہے)۔

دین کے نام پر نو نو سال کے کورس کی تیاری کے ماحصل کا نتیجہ

عزیزانِ من! اگر کوئی یہ بات سمجھ نہ سکے تو وہ اپنے ساتھ والے کسی بھائی سے پوچھ لے کہ میں نے کہا کیا ہے۔ یہ سارا کچھ اس طرح ہی ہے اور یہ سارے علوم جو آج پڑھائے جاتے ہیں، یہ نو سال تک پڑھاتے ہیں۔ اٹھارہ علوم ہیں۔ یہ سارے اون ویلنے کے اوپر ہیں، تو اب بساطِ دنیا کا جو کوئی اور کام نہ رہا، تو انہوں نے یہی کچھ کرنا تھا (اور کرنا) ہے۔

65ء کی جنگ میں پاک فوج کی فتح کا راز: ''کھان پین دے کم ویلیاں دے ہوندے ہیگے''

افوہ! یہ کیا بات یاد آ گئی، صاحب! ایک ان پڑھ زمیندار فوج کا صوبیدار میجر یاد آ گیا۔ پھر ستمبر کا مہینہ آ رہا ہے، پھر 65ء کی جنگ یاد آ رہی ہے، جسے اس ناشکری قوم نے اس طرح سے فراموش کیا ہے اور خود بھگت رہے ہیں۔ میں 1965ء میں انڈیا اور پاکستان کی جنگ کے بعد ان میدانوں کو دیکھنے کے لیے گیا تھا، جہاں ان شہداء کے خون کی داستانیں رقم تھیں اور پھر ان کا ذکر طلوعِ اسلام میں ''پاکستان کی نئی زیارت گاہیں'' کے عنوان سے شائع کیا۔ میں جلّو، اٹاری وغیرہ کے مقام پہ گیا۔ ویسے تو صلح ہو چکی تھی، اس وقت فتح کے بعد جنگ تو نہیں تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہاں اس کنارے کے اوپر ایک سپاہیوں کی ٹکڑی (گروہ) تھی اور اس کا ایک کمانڈر صوبیدار میجر تھا، دوسری طرف سامنے ہندوؤں کی پلٹن تھی لیکن جنگ نہیں تھی۔ میں ان سب سے باتیں کرتا تھا۔ یہ بڑی معرکے کی جنگ تھی جو 65ء میں لڑی گئی تھی، جس میں تین دن اور تین راتیں مسلسل ایک منٹ کے وقفہ کے بغیر یہ جنگ ان سپاہیوں نے لڑی تھی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ یہ آپ کے سپاہی تین دن کی متواتر جنگ لڑے! کہنے لگے! جی ہاں! ہم ہی تھے۔ وہ تو یونہی میں نے پوچھ لیا کہ تین دن تین راتیں آپ لڑتے رہے تو اس دوران کچھ کھانے پینے کا کیا کیا۔ عزیزانِ من! اس ان پڑھ صوبیدار میجر سپاہی نے مجھ سے جو کہا، وہ ایک نہ بھولنے والی داستان ہے۔ کہنے لگا: ''میاں صاحب! اے کھان پین دے کم ویلیاں دے ہوندے ہیگے'' اللہ اکبر! (یہ کھانے پینے کے کام تو فارغ لوگوں کے ہوتے ہیں) ارسطو بھی یہ بات نہیں کہہ سکتا جو وہ دو لفظوں میں کہہ گیا کہ ''کم ویلیاں دے ہوندے ہیگے'' (یہ کام تو فارغ لوگوں کے ہوتے ہیں)۔ کہنے لگے کہ ''چنوں کی ٹوکری بھی ہمارے ساتھ ہوتی تھی، پانی کی وہ کپی بھی ہوتی تھی مگر اس کی فرصت کسے تھی کہ سوچے کہ چنا کھائے یا کھانا کھائے''۔ ارے! کس کو فرصت تھی کہ وہ اس چیز کو دیکھتا۔ ''بلبل نے پھول سے کیا کہا؟ پھول نے کیا جواب دیا، صبا کیا کہتی ہوئی گزر گئی؟'' یہ جاننے کی کسے فرصت تھی!''

نو نو سال کے بعد فارغ التحصیل ہونے والوں کے مابین بحثیں اور مُرسلین کا انتباہ

عزیزانِ من! یہ تو بس یوں کہو کہ ''ویلی جُٹی اُن ویلے'' اور ہم کو انہی بحثوں کے اندر الجھا دیا۔ سارے علوم جو آج پڑھائے جا رہے ہیں، جن کے بعد یہ فارغ التحصیل ہو کر عالم کا درجہ لیتے ہیں، وہ یہ تعلیم ہوتی ہے، یہ بحثیں ہوتی ہیں جو انہوں نے پڑھی ہوئی ہوتی ہیں۔ ہمارے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وہ ہمارے بھیجے ہوئے تھے، وہ جو خدا کے فرستادہ تھے، انہوں نے وہاں یہ بات کہی تھی اور خدا نے کہا ہے کہ وہ بشارت ہم نے دی تھی اور ہم جانتے تھے کہ تمہارے ہاں

پہلے اولاد کیوں نہیں ہوئی تھی اور اب تم میں یہ صلاحیت کس طرح پیدا ہوسکتی ہے۔

اب ابراہیم علیہ السلام سمجھ گئے کہ وہ خدا کے رسول ہیں اور کسی خاص مہم کے لیے آئے ہیں اس لیے کہا کہ: قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ (51:31)۔ دیکھیے! یہاں قرآن حمید میں مرسلون کا لفظ آیا ہے۔ اس نے پوچھا کہ اے خدا کے بھیجے ہوئے قاصدو! تم کس مشن پہ آئے ہو؟ کیا محض مجھ سے ملنے آئے ہو؟ کہا گیا کہ:

قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۳۲﴾ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ﴿۳۳﴾ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۴﴾ (51:32-33-34) انہوں نے کہا کہ ہم حضرتِ لوط علیہ السلام کی طرف جارہے ہیں یا قوم لوط علیہ السلام کی طرف جارہے ہیں یا قوم لوط علیہ السلام کی بستیوں کی طرف جارہے ہیں۔ وہ انسانیت سوز جرم میں حد سے بڑھ گئی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن حمید میں اسے لواطت کہتے ہیں اور میں نے کہا تھا کہ اب ہمیں یہ لفظ استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ اس لفظ سے حضرتِ لوط علیہ السلام کی طرف ذہن چلا جاتا ہے۔ یہ ہے Homo Sexuality [1]۔ ان کی تباہی کے دن آ گئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ان کے اوپر آسمان سے پتھروں کی بارش ہوگی، وہاں وہ یہ سمجھا رہے ہیں کہ جو لوگ حضرتِ لوط علیہ السلام پر ایمان لائے ہوئے ہیں ان میں اطلاع دیدی جائے کہ وہ اس سے پہلے اس بستی سے نکل جائیں، چلے جائیں۔

جرائم اور آفاقی آفتوں کا تعلق، قومِ لوط علیہ السلام کا گھرانہ اور کھنڈرات بطور سامانِ عبرت

عزیزانِ من! آگے مختلف اقوام کا ذکر آتا ہے، وہاں پہنچنے پر میں یہ عرض کروں گا کہ اس فعلِ بدنہادی کا اور پتھروں سے لائی جانے والی اس تباہی کا آپس میں کیا تعلق تھا؟ فلاں قوم نے اس قسم کے جرائم کیے تو جھکڑ آیا، وہ تباہ ہوگئے، فلاں نے اس قسم کے کیے تو سیلاب آیا، وہ تباہ ہوگئے، فلاں نے ایسا کیا تو زلزلہ آیا، وہ تباہ ہوگئے۔ ان دونوں میں تعلق کیا ہے یعنی ان کے ان اخلاقی جرائم کا یا مظلوم پر ظلم وستم کا اور آفاقی آفتوں کا آپس میں کیا تعلق ہے اور جس طریق سے وہ تباہ ہوئے ہیں اس کا اخلاقی جرائم سے کیا تعلق ہے؟ کہا کہ: فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳۵﴾ فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۳۶﴾ (51:35-36) اس ساری بستی میں ایک ہی گھر تھا جو خدا کے قوانین کو صحیح مانتا تھا، اس پہ ایمان لایا تھا، اس کے سامنے جھکا ہوا تھا، ایک ہی گھرانہ تھا، ایک ہی گھر تھا اور وہ حضرتِ لوط علیہ السلام کا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ: بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۳۶﴾ (51:36) کے معنی وہی ایک ہاؤس نہیں ہوسکتا۔ وہ یہی ہے کہ وہ ایک مرکز، ایک گھرانہ، ایک خاندان تھا کیونکہ یہ جو حضرتِ لوطؑ کا گھر تھا، اس میں تو یہ بتایا گیا تھا کہ انؑ کی بیوی بھی خلاف تھی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس گھرانے کی تو خود حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی بھی مخالفین میں سے تھی، اس لیے وہ بھی ان کے ساتھ ہی تباہ ہوگئی تھی اور خیر! کہا ہے کہ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۳۶﴾ (51:36) ایک ہی گھرانہ تھا جو پوری بستی میں اسلام لایا ہوا تھا۔ کہا کہ: وَتَرَكْنَا فِيْهَآ اٰيَةً لِّلَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ الْعَذَابَ

---

[1] جرمیات کی اصطلاح میں اسے Crimen innominatum کہتے ہیں۔ مثلاً Buggery اور Sodomy۔ آج اس کی نئی شکل Lesbian اور Gays کی صورت میں بھی آئی ہے۔ یہ تمام Homo Sexuality کی ہی صورتیں ہیں اور ان کا اثر اقوام کے کلچر پر پڑتا ہے۔

الْاَلِیْمَ (51:37) اس واقعہ میں جو اس بستی کے کھنڈرات پر منقوش چلا آ رہا ہے' ان لوگوں کے لیے عبرت وموعظت کا سامان ہے جو غلط روش زندگی کے الم انگیز انجام سے ڈرتے ہیں۔

قرآنِ حکیم میں بیان کردہ تاریخی واقعات کا مقصد ثبوت کے طور پر حقائق کو سچ ثابت کرنا ہے:

عزیزانِ من! اب یہ ہوا مقصد اس داستان کے بیان کرنے کا کہ جو بعد میں آنے والے ہیں' وہ اس سے عبرت پکڑیں کہ اس قسم کے معائب اور جرائم کا نتیجہ تباہی ہوا کرتا ہے۔ بات اتنی ہے جو قرآن حکیم نے بتائی ہے۔ واقعہ تاریخ کا بیان کرتا ہے کہ محسوس شواہد سے بات جلدی سمجھ میں آ جاتی ہے اور زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔ میں نے کئی دفعہ یہ بتایا ہے کہ قرآن حکیم نے انہی اقوام کا اس لیے ذکر کیا کہ یہ عرب ان راستوں سے دن رات گزرتے تھے اور وہاں ان قوموں کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات پڑے ہوتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ باتیں انہی کی کیا کرتے تھے' ان کے ہاں ان قوموں کا عام چرچا تھا۔ یہ ان کے سامنے کی بات ہے' اس لیے قرآن حکیم نے متعدد مقامات پہ کہا ہے کہ تم وہاں سے دن رات گزرتے ہو' تو دیکھو! ان اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات کی اینٹوں پر' ان کی کیا داستانِ عبرت لکھی ہوئی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم کہانیوں کی طرح ان داستانوں کو دہراتے رہتے ہو۔ ان کہانیوں کا جو اصل مقصد ہے' وہاں نہیں پہنچتے' تو یہی کچھ اگر تمہارے ہاں ہوا تو یہی انجام تمہارا ابھی ہو جائے گا۔ یہ ہے جو وَتَرَكْنَا فِيْهَآ (51:37) آیا تھا۔ یہ ہے اصل مقصد داستان کے دہرانے کا کہ آنے والوں کے لیے ہم نے ایک پیغامِ عبرت رکھا ہے کہ وہ سوچیں کہ ایسی روش کا نتیجہ یہ ہوا کرتا ہے اور محض اتفاقی یا ہنگامی طور پہ نہیں ہو جاتا' یہ Not By Chance ہوتا ہے' خدا کے مقرر کردہ قانونِ مکافات کے مطابق ایسا ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ ہی ایسا ہوتا ہے' ہمیشہ ایسا ہوگا۔ یہ میں نے قومِ لوط کے متعلق کہا ہے کہ اس سورۃ میں' ان آیات میں' تفصیل نہیں دی اور تفصیل چونکہ مختلف مقامات پر ہمارے سامنے آ چکی ہے' آگے بھی آئے گی' اس لیے میں بھی ان اشاروں تک ہی اپنے آپ کو محدود رکھتا ہوں ورنہ ایک ایک کی تفصیل میں جاؤں تو اس میں تو پھر دو دو چار چار دروس لگ جائیں گے۔ وہ تفصیل اپنے مقام پہ سامنے آ بھی ہے ہیں اور سامنے آتی بھی رہے گی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام' فرعون کے دربار میں اپنے محکم دلائل کے ساتھ: یہ جادوگری نہیں تھی

عزیزانِ من! ہر نبی کی طرح پھر قومِ موسیٰ علیہ السلام کا ذکر آ گیا۔ کہا کہ: وَفِيْ مُوْسٰٓى اِذْ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى فِرْعَوْنَ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ [1] (51:38) حضرت موسیٰ علیہ السلام کو واضح کھلے ہوئے دلائل دے کر فرعون کی طرف بھیجا۔ اب اتنے سے یہ بات یہاں سمجھ میں آ گئی کہ وہ جو ہمارے ذہن میں ہے کہ وہاں جادوگری کا کوئی کھیل تھا اور وہ عصا پھینکتے تھے تو وہ اژدھا بن گیا' ہاتھ دکھایا تو وہ چاند کی طرح چمکنے لگ گیا اور سامنے سے بھی وہ جادوگر تھے اور میدان میں جادوگری کا کھیل تھا۔ یہ جو بات تھی کہ

---

[1] اور اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں بھی (اربابِ بصیرت کے لیے حقیقت بینی کی) نشانیاں ہیں۔ جب ہم نے اسے' فرعون کی طرف' واضح دلائل وقوانین دے کر بھیجا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1225)۔

اِدھر سے انہوں نے جادو کا کھیل کھیلا' اُدھر سے خدا کا ایک اولوالعزم پیغمبر بھی جادو کا کھیل کھیل رہا تھا اور یہ زیادہ زبردست جادوگر ہوا۔ تو یہ ہوا خدا کے پیغمبر کا کام' جس کو خدا نے خود کہا تھا کہ ہم نے تیری تربیت بچپن سے آج تک کی ہے اس لیے کہ ہمیں تجھے ایک بہت بڑی مہم پہ بھیجنا ہے تو کیا یہ ساری کی ساری مہم جادوگری کا کھیل تھی اور اللہ تعالیٰ ساری عمر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جادو سکھاتے رہے؟ عزیزانِ من! یہ چیزیں اپنے مقام پہ آ چکی ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اتنا بڑا جادو تھا کہ یہ کامیاب ہو گئے جبکہ قرآن کریم کہتا ہے کہ جادوگر جدھر سے جی چاہے آ جائے' کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا لیکن یہ تو جادو کو کامیاب کہتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے ساتھ فرعون کے سامنے بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ (51:38) دلائل لے کر گئے تھے۔ ہر نبی اپنے پیغام کو دلائل اور براہین کی رو سے پیش کرتا ہے۔

یہ آج کی بات نہیں ہے' اس دور کی بھی ہے' جو ابھی جہالت کا دور تھا۔ عام طور پہ قومیں اس کی واقف نہیں تھیں' نبی پہلے دن سے دلیل سے بات کرتا تھا۔ خدا نے ہر نبی کے متعلق کہا ہے کہ وہ دلائل پیش کرتا تھا اور وہ مقابلے میں دھاندلی کرتے تھے اور پھر آخر میں ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس دور میں آئے ہیں۔ اتنا تو کم از کم آپ دیکھیے' یہاں تو یہ ہوا کہ حضرتِ نوح علیہ السلام کے زمانے میں سیلاب آ گیا تو وہ قوم ڈوب گئی۔ حضرتِ لوط علیہ السلام کے زمانے میں پتھراؤ ہو گیا تو وہ قوم برباد ہو گئی' جو قوم عاد تھی تو وہاں زلزلہ آیا' جو قومِ ثمود تھی اس وقت جھکڑ چلا' وہ تباہ ہوئی تو یہ اگر اسی طریقے سے' ان کے جرائم کے بدلے میں' ان کو سزا دینے کے یا تباہ کرنے کے انداز تھے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پورا دور ہمارے سامنے ہے' اس میں تو کوئی بات بھی معجزانہ نہیں ہوئی۔

جنگِ اُحد میں شکست کی وجوہات اور پھر فتح کی نوید

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدینے کی زندگی میں سات سال تک چھوٹی موٹی جھڑپوں اور بڑی بڑی جنگوں کی صورت میں بیاسی لڑائیاں لڑی گئیں۔ ان میں کامیابی بھی ہوئی اور شکست بھی ہوئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود زخمی ہو گئے' جنگِ احد کے اندر تو چھلنی ہو گئے' کہہ رہے ہیں کہ تیریوں چبھے ہوئے تھے جیسے شہد کی مکھیاں چھتے پہ ہوتی ہیں۔ صحابہؓ نے دیوار بن کر' کھڑے ہو کر بچایا تھا۔ بیٹی زخم بھرنے کے لیے مرہم لگانے آئی تھیں۔ وہاں شکست ہوئی ہے' قرآن کریم نے شکست کا ذکر کیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ بھئی! شکست اس لیے ہوئی کہ تم نے اپنے کمانڈر کی جو ہدایات تھیں' ان کو نظرانداز کر دیا' جس مقام پہ اس نے تمہیں کھڑا کیا تھا اس مقام کو چھوڑ کر ادھر آ گئے' دشمن نے جگہ خالی دیکھی' وہ آ گیا اور یہ کہا گیا کہ گھبراؤ نہیں' یہ جو بات ہے اسے دیکھو کہ ایسا کرنے سے یہ ہوتا ہے' آئندہ ایسا نہ کرنا' ورنہ پھر ایسی شکست ہو جائے گی۔ شکست بھی اس لیے ہوتی تھی کہ Strategy (حکمت عملی) میں کوئی غلطی ہو جاتی تھی' اس لیے دشمن کو کامیابی ہوتی تھی۔ مدینے کے گرد حفاظت کے لیے خندق جسے وہ جنگِ خندق کہتے ہیں' عرب میں اس سے پہلے جنگ کی اس سٹریٹجی کو کوئی جانتا نہیں تھا' جب کوئی اور طریقہ نظر نہیں آیا تھا۔ قرآن حکیم نے حکم دیا ہے کہ اپنی سرحدوں پر طاقت ور رسالے رکھو کہ دشمن کو تمہاری طرف قدم بڑھانے کی جرأت ہی نہ

ہو۔ یہ کوئی معجزہ نہیں ہو رہا تھا۔

قومِ نوح علیہ السلام کی تباہی کے اسباب اور اس سے محفوظ رہنے کا طریق

تو یہ بھی جو انبیائے سابقہ کے زمانے میں ہم باتیں دیکھ رہے ہیں، وہ فطرت کے قوانین کی رو سے ہی ایسا ہوا۔ اب میں ابھی عرض کروں گا کہ پھر جرائم اور تباہی کی آفتوں، ان دونوں میں، تعلق کیا تھا؟ اب سیدھی سی بات یہ ہے ہر نبی کے سلسلے میں جو آتا ہے کہ ان پہ یہ تباہی آئی، تو وہاں یہ ہے کہ وہ جو ایمان لے آئے ہوئے تھے، ہم نے انہیں اس سے پیشتر ہی اطلاع دیدی اور وہ وہاں سے نکل گئے ورنہ ہونا تو یہی چاہیے تھا کہ اس بستی پہ پتھر برستے رہیں، یہ جتنے بھی فاسد اور گنہگار مجرم ہیں ان کو تو لگیں اور یہ جو ایمان والے ہیں ان کو وہ پتھر اور تیر نہ لگیں، وہ تو حضورِ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی لگے، یہ ہوتے تو ان کو بھی لگتے، ان کو وہاں سے نکال لیا گویا طریقہ یہ ہے۔ پہلا ہی ذکر حضرتِ نوح علیہ السلام کا آتا ہے۔ یہ سیلاب آنے والی بات ہے۔ اس سے پیشتر نظر آتا ہے کہ وہ لوگ جانتے نہیں تھے کہ کشتی کسے کہتے ہیں۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ ہم نے پہلی دفعہ نوحؑ کو یہ سکھایا کہ کشتی یوں بنائی جاتی ہے۔ وہ دور ایسا تھا کہ کشتی بنانا بھی خدا کی طرف سے وحی کے ذریعے ہوا تھا، یہ پہلے نہیں تھا۔ وہ کشتی بنا رہے تھے، یہ بتا رہے تھے کہ ایک سیلاب آنے والا ہے، اس میں اِسی سے بچا جائے گا، وہ مذاق کرتے تھے۔ اگر وہ، عزیزانِ من! ان کو مذاق نہ کرتے، Seriously (سنجیدگی سے) لیتے اور وہ بھی کشتی بنانے لگ جاتے تو وہ بھی بچ جاتے۔ بچایا تو کشتی نے ہے۔ جس کے پاس کشتی ہوگی، وہ بچ جائے گا۔

حضرتِ نوح علیہ السلام نے اپنے کافر بیٹے کو آواز دی تھی کہ آ جاؤ، تم بھی یوں بچ جاؤ۔ یہ تو الگ بات ہے کہ اسی نے انکار کر دیا ورنہ وہ آتا، کشتی میں بیٹھ جاتا، وہ بھی بچ جاتا، نہیں بیٹھا ہے تو ڈوب گیا ہے۔ میں ابھی عرض کروں گا کہ پھر ان دونوں میں تعلق کیا ہے؟ کہا ہے کہ: فَتَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ وَقَالَ سٰحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ (51:39) انہوں نے اپنی قوت سے، انانیت سے، اس میں اعراض برتا کہ میں بہت بڑا ہوں، تمہاری بات کیوں مانوں، تم تو غلام قوم کے فرد ہو، اس کے فائدے کی بات کر رہے، اس کے بچنے کی، تباہی سے محفوظ رہنے کی، بات کر رہے ہیں۔ اس نے نہیں مانا، انانیت میں نہیں مانا، قوت کے زور پہ نشے میں تھا، وہ بات نہیں سمجھنے کی کوشش کی۔ کہا کہ یہ مذاق کرتے ہیں۔ کہنے لگے کہ یہ یا تو اپنے دعوے میں بہت بڑا جھوٹا ہے، یاد رکھیے! عربی زبان میں ''سحر'' کے معنی جادو ہی نہیں ہوتا، باطل کے لیے بھی یہ لفظ آتا ہے، جھوٹ کے لیے بھی آتا ہے، کذب کے لیے بھی آتا ہے، ہر بناوٹی چیز کے لیے بھی آتا ہے۔ کہا کہ یہ اپنے دعوے میں جھوٹا ہے یا تو دانستہ جھوٹ بولتا ہے یا یہ پاگل ہو گیا ہے۔ مجھ سے کہہ رہا ہے کہ اے! تم تباہ ہو جاؤ گے یہ جو تمہاری قومِ غلام ہے، یہ صاحبِ قدرت ہو جائے گی۔ کہتے کہ یہ پاگل کی بات نہیں تو اور کس کی بات ہو سکتی ہے۔ اگر وہ سنجیدگی سے سوچتے، جو کچھ یہ کہہ رہے تھے تو بچ جاتے۔ آگے کہا کہ: فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِى الْيَمِّ وَهُوَ مُلِيْمٌ (51:40) تو نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے کان ہی نہیں دھرا کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں، کہ تمہاری تباہی آ جائے گی، قوت کے زور میں، اس نشے میں، بدمست رہے، نتیجہ یہ ہوا۔ غلط چال چلی، یہ تو پار لگ گئے، وہ ڈوب گئے۔

قومِ عاد اور قوم ثمود کے غلط نظامِ حیات کا نتیجہ: قوت کا نشہ

قومِ عاد کا بھی واقعہ تم کو معلوم ہے۔ کہا کہ: وَفِيْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ ﴿٤١﴾ مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ اَتَتْ عَلَيْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيْمِ ﴿٤٢﴾ (42-51:41) ایک جھکڑ چلا' ایک ہوا چلی' ہلاکت انگیز آندھی آئی۔ یہ تباہ کرنے والی تھی' اس نے کسی چیز کو چھوڑا ہی نہیں ہے۔ وہ جس پہ سے گزری اسے چورا چورا کر کے رکھ دیا۔ آگے کہا کہ: وَفِيْ ثَمُوْدَ اِذْ قِيْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰى حِيْنٍ ﴿٤٣﴾ (51:43) اور ثمود کے وقت میں بھی یہ کیفیت ہوئی۔ ان کو وارننگ دی تھی کہ باز آ جاؤ' تمہارے پاس تھوڑا سا وقت ہے' بچ جاؤ گے۔ کہا کہ: فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ (51:44) انہوں نے بھی سرکشی برتی' مذاق سمجھا کہ کیا کہہ رہے ہیں' ہم کیسے تباہ ہو سکتے ہیں؟ قوت کے نشے میں ہر شخص یہی کہہ رہا ہوتا ہے۔ عزیزانِ من! کہ ہم کیسے تباہ ہو سکتے ہیں؟ اسی دور میں' اسی زمانے میں' جن کے پاس یہ قوت نہیں ہوتی' یعنی جو اس نشے میں نہیں ہوتے' وہ دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ تباہی آ رہی ہے' انہیں تو نظر آتا ہے' مگر یہ کچھ کر نہیں سکتے۔ انہیں اسی سے کہنا ہوتا ہے' وہ اس نشے میں ہوتا ہے اور جو نشے میں ہوتا ہے' وہ تو کوئی سمجھ کی بات مانتا ہی نہیں ہے۔ ہر شرابی کے نشے کو دیکھیے! نشے کا پہلا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو میں نہیں کہتا' ہم کہتا ہے: ''اوئے اسی وڈے ہونے آں۔ او اپنے آپ نوں ''اسیں'' کہن لگ پیندا اے۔'' (ابے! ہم بڑے طاقتور ہوتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ''ہم'' کہنے لگ جاتے ہیں)۔

دولت اور قوت کے نشہ نے انسان کو آنا اور انی کے فرق کو محسوس کرنے سے ہمیشہ محروم رکھا ہے

جب بھی کوئی دوسرے کو ''تو'' اور اپنے آپ کو ''ہم'' کہنے لگ جائے تو سمجھ لیجیے کہ یہ نشے میں ہے' پھر کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ کہتا ہے کہ: اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴿٢٤﴾ (79:24) یہ تھا فرعون۔ وہ ''انی'' بھی نہیں کہہ رہا۔ وہ ''انا'' کہہ رہا ہے۔ خدا ہوا' صرف خدا کو وہ طاقت حاصل ہے' وہ اپنے آپ کو ''انا'' کہتا ہے لیکن وہ بھی جب بندوں کے ساتھ بات کرتا ہے' ان کے ساتھ برتتا ہے تو اپنے آپ کو ''انی'' کہتا ہے' یہ ان کو ''انا'' نہیں کہتا ''انی'' اور ''انا'' میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ قرآن کریم کے انداز عجیب ہیں۔ پھر انا کہنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ کہا ہے کہ: فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِيَامٍ وَّمَا كَانُوْا مُنْتَصِرِيْنَ (51:45) کیا بات کہی ہے کہ ان کے غلط نظام سے ان بدمستوں کی یہ کیفیت ہوگئی۔ یہاں دو الفاظ ہیں' عزیزانِ من! کہ نہ تو اتنی قوت رہی کہ اپنے پاؤں پہ کھڑے رہ سکیں اور جنہیں سمجھ رکھا تھا کہ ایسے وقت میں وہ ہمیں مدد دیں گے' نہ ان کی صاحب! کوئی مدد پہ آیا۔

ظہورِ نتائج کے وقت کوئی کسی کا پُرسانِ حال نہیں ہوتا

عزیزانِ من! یہ باتیں دو ہزار سال یا چار ہزار سال پہلے کی نہیں ہو رہیں' ارے دل! یہ تو اپنی داستاں معلوم ہوتی ہے۔ کہا کہ نہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی سکت رہی اور جن کے متعلق سمجھتے تھے کہ وہ بچا لیں گے نہ وہ بچانے کے لیے آئے۔ بنگال ❶ میں ہی وہ جو بیڑا کہہ رہے تھے' سات دن تک اِدھر سے اُدھر تیرتا رہا اور مشرقی پاکستان بصورتِ بنگلہ دیش آپ کے

❶ یہ 1971ء کی جنگ میں امریکا کے اس بحری بیڑے کی طرف اشارہ ہے جو اس نے سات دن کے اندر بھیجنے کا کہا تھا۔

ہاتھ سے نکل گیا۔ یہ جو مدد دینے کے وعدہ کرتے ہیں وہ تو اس وقت' پھر یہ آپ خود Calculate (حساب کتاب) کرتے ہیں کہ ہمارا فائدہ کس میں ہے۔ آپ کو قائم رکھنے میں ان کا فائدہ ہوتا ہے تو آپ کو مدد دیتے ہیں' اگر اپنا غلام بنانا ہوتا ہے تو ہر قسم کی مدد دیتے چلے جاتے ہیں' قربانی دا بکرا بندا تر یا جا' (قربانی کا بکرا بنتے چلے جاؤ)۔ اگر وہ دیکھتے ہیں کہ نہیں' ادھر اس کو کٹوا ہی دینا چاہیے ادھر زیادہ فائدہ ہے' اُدھر کر دیتے ہیں۔

انسانی زندگی کا جوہر خود اعتمادی کی بنیاد پر استطاعت پیدا کرنے میں مضمر ہے

کیا بات کہی ہے کہ: فَمَا اسۡتَطَاعُوۡا مِنۡ قِيَامٍ (51:45)۔''استطاعت'' کے معنی ہیں: اپنے طور پر خود کھڑے ہونے کی طاقت۔ کہا کہ انہوں نے اپنے طور پر خود کھڑے ہونے کی استطاعت نہ پیدا کی اور جنہیں سمجھتے تھے کہ ایسے وقت میں وہ ہماری مدد کو پہنچ کر بچا لیں گے' ایسے میں کسی نے آواز تک نہیں دی۔ کیوں کسی نے مدد نہیں کی؟ یہ بات تو پرانے دور کی نہیں یہ تو ہر دور کی داستان ہے۔ کہا ہے کہ: وَقَوۡمَ نُوۡحٍ مِّنۡ قَبۡلُ ؕ اِنَّهُمۡ كَانُوۡا قَوۡمًا فٰسِقِيۡنَ (51:46) اور سب سے پہلے جو قوم نوح علیہ السلام سے بات شروع ہوئی تھی تو کیا جرم تھا ان کا؟ یہ کہ انہوں نے معاشی طبقات پیدا کر دیئے ہوئے تھے۔ یہ عجیب بات ہے یہ پہلا نبی' پہلی قوم' پہلی داستان ہے اور بات قرآن حکیم شروع کرتا ہے طبقات کی تقسیم سے کہ ان کے ہاں کے جو دولت مند طبقات تھے' سردار تھے' وہ سردار وہی بن جاتے تھے جو جاگیردار اور دولت مند ہوتے تھے' وہ کہتے تھے کہ یہ جو کام کرنے والے جن کو ہم کمّی کہتے ہیں' ہم بھی گاؤں میں ان کو کمی کہا کرتے تھے' وہ کمّی سے ذرا آگے چلے تو کمین ہو گئے' یہ تمہارے ہاں کا جو کام کرنے والا طبقہ ہے' یہ نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اندازہ لگایئے کس قدر Perversion (بدنہادی) ہوتی ہے کہ کام کرنے والا نفرت کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ گاؤں میں کمّی کام کرنے والے کو کہتے تھے اور وہ پست درجے کے سمجھے جاتے تھے۔

طبقاتی تفریق تو انسان کو انسانیت کے مقام سے متعارف ہی نہیں ہونے دیتی:

عزیزانِ من! آج بھی' میرا خیال ہے' گاؤں میں یہ ہوگا۔ میرے زمانے میں تو یہی ہوتا تھا' اُس دور میں بھی یہ بات تھی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ یہ کمّی ہیں' یہ کام کرنے والے ہیں' یہ ہمارے مقابل میں کیسے بیٹھ سکتے ہیں۔ ان کا دعویٰ یہ تھا۔ یہ نہیں کہ جو بات تم کہتے ہو' وہ غلط ہے' ہم اسے نہیں مانتے۔ کہتے تھے کہ یہ جو چیز ہے کہ یہ بھی ہمارے برابر آ کر بیٹھ جائیں' ہم اسے برداشت نہیں کر سکتے۔ اس قوم کی تباہی کس طریق سے آئی؟ استعارةً کہوں گا کہ پانی کے سیلاب سے اور پانی تو پھر گڑھے کو اور اونچ و نیچ کو برابر کر دیا کرتا ہے۔ اس میں تو پھر کمّی اور سردار برابر کر دیئے' وہاں کمی تو بچ گئے۔ یہ کیسے بچے؟ جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ حضرتِ نوح علیہ السلام کشتی بنا رہے تھے۔ اگر یہ معجزے سے بچنا ہوتا تو پھر کشتی بنانے کے کیا معنی ہوئے؟ کشتی کے ذریعے بچنا ہے تو مومن اور کافر دونوں بچ سکتے ہیں۔ وہ جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ وہ تو کافر بیٹے کو آواز دے رہے تھے کہ آ جاؤ۔ وہ بیٹھ جاتا تو بچ جاتا۔ وہ خود نہیں بیٹھا تو بات تو آج بھی ہمارے لیے تباہیوں کے سیلاب سے بچنے کے لیے یہ ہے کہ جو قبل از وقت کشتیاں بنا لیتے ہیں وہ تو بچ جاتے ہیں اور جو اس وقت اپنے عیش و عشرت میں اور کھیل تماشے اور عیاشی میں' اپنی

مفاد پرستیوں میں، لگے رہتے ہیں، کشتیوں کی فکر نہیں کرتے تو پھر

سیلاب نہ پُرسد درِ میخانہ کجاست

عزیزانِ من! یہ بڑا عمدہ مصرع ہے۔ سیلاب آتا ہے تو یہ آکر نہیں پوچھتا کہ جی! دروازہ کہاں ہے جو میں وہاں سے داخل ہو جاؤں، وہ دروازہ نہیں پوچھا کرتا: سُیلاب نہ پُرسد در میخانہ کجاسب۔ وہ سب کو برابر کر دیتا ہے۔

وحی کی روشنی میں تعمیر کردہ معاشرتی بند قوموں کو سیلاب کی تباہی سے محفوظ کر دیتا ہے: قرآنِ حکیم کا ایک سنہری اصول

آخر میں آکر قرآن حمید نے یہ بات کہی کہ جو قوم سیلاب کی آمد سے پہلے کشتیاں بنا لیتی ہے، وہ تباہی سے بچ جاتی ہے۔ اب تو خود بیٹھ کر سوچ لو کہ کس قسم کے سیلاب آنے والے ہیں اور تم نے اس سے بچنے کے لیے کیسی کشتیاں بنانی ہیں لیکن وہ کہتا ہے کہ جو قوم بھی ان مقاصد کو چھوڑ کر عیش وعشرت میں پڑ جائے، قوت کے نشے میں پڑ جائے، انانیت کا شکار ہو جائے، وہ مدہوش ہو جاتی ہے اور یہ جو ساری قوم کی بات ہے، وہ یہ نہیں کرتا۔ وہ تو بڑی پتے کی بات کہتا ہے۔

غالباً حضرت صالح علیہ السلام نے ہی یہ کہا تھا یا حضرت ھود علیہ السلام نے یہ کہا تھا، دونوں ❶ میں سے ایک نے کہا تھا کہ یا اللہ! یہ تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے، میں ان کی اصلاح کیسے کر سکوں گا۔ اس قوم کی اتنی بڑی تعداد ہے، اس قدر یہ بگڑی ہوئی قوم ہے، ان میں خرابیاں ہی خرابیاں ہیں، تو میں کس طرح ان کی اصلاح کروں گا۔ کہا گیا کہ یہ ساری قوم کی بات نہیں، دارالخلافے میں نو بدمعاش ❶ اکٹھے ہوئے بیٹھے ہیں، ان کا انتظام کر دو تو ساری قوم ٹھیک ہو جائے گی، قوم تو ان کی وجہ سے بگڑتی ہے۔ کیا کیا باتیں نہیں بتا گیا قرآن حکیم! یہ ہے بات لیکن جب یہ انہیں ٹھیک نہیں کرتی، یہ ساتھ تباہ ہوتے ہیں تو پھر قرآن کریم یہ بھی کہتا ہے کہ یہ جہنم میں کہیں گے کہ بارِ الہا! انہوں نے ہمیں تباہ کیا تھا، انہیں دگنی سزا دے، ہمیں کیوں سزا دی جا رہی ہے، ہم تو بے بس تھے۔ انہوں نے تباہ کیا تھا۔ جواب ملے گا کہ ان کو جو قوت حاصل تھی، وہ کس کی بدولت حاصل تھی؟ وہ تمہاری ہی دی ہوئی قوت تھی جو انہیں حاصل تھی ورنہ ان کے تو دو ہی بازو تھے، اگر تم ان کی تقدیر کا سامان نہ بنتے تو یہ کیا کر سکتے تھے، تم ذریعہ ہو ان تمام خرابیوں کا جو ان کے ہاتھوں سے برپا ہوئی ہیں۔ اس لیے تمہیں بھی وہی سزا ملے گی، جو ملتی ہے۔ ٹھیک ہے:

ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

یہ کوئی Excuse (بہانہ) نہیں ہے کہ ہم نہیں۔ قرآن کریم ان داستانوں کو، عزیزانِ من! اس لیے دہراتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ چیزیں جنہیں ہم فطرت کے حوادث کہتے ہیں یعنی یہ سیلاب، جھکڑ، تیز ہوائیں، زلزلے آتے رہتے ہیں۔ جو قومیں قبل از وقت ان کے متعلق انتظام کر لیتی ہیں وہ ان سے بچتی ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ جن قوموں کے اکابرین اپنی مفاد پرستیوں میں پڑے رہیں، اپنی

---

❶ یہ حضرت صالح علیہ السلام تھے۔ کہا ہے کہ (27:48-49) اور (دیکھو) شہر میں نو آدمی تھے جو (ہمیشہ) ملک میں فساد برپا کرتے تھے اور (کبھی) اصلاح (کا خیال) نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے (آپس میں مشورہ کیا اور) کہا کہ ایک دوسرے کے سامنے خدا کی قسم کھا لو کہ ہم رات کو اس پر اور اس کے گھر والوں پر یکبارگی حملہ (کر کے انہیں قتل کر دیں گے اور) پھر (جب پوچھ گچھ ہوگی تو) ہم اس کے وارثوں سے کہہ دیں گے کہ ہم اس کے خاندان کی ہلاکت کے وقت موجود نہیں تھے (نہ ہمیں اس بارے میں کوئی خبر ہے) اور ہم (اپنے اس بیان میں بالکل) سچے ہیں! (پرویزؒ: جوئے نور (1994)، ص 77۔

عیش پسندیوں میں پڑے رہیں، اپنی ہی وہ چالیں چلتے رہیں، وہ اپنی بساط پر ہی اس میں منہمک رہتے ہیں تو پھر انتظامات کے معاملے میں، یہ کام نہیں دیتیں۔ بعض اوقات، وہ ادھر سے غافل ہو جاتے ہیں، اس کو Neglect (فراموش) کر دیتے ہیں تو تباہی آ جاتی ہے۔

قومِ سبا کی تباہی کی وجۂ جواز

ارم کی جو قومِ سبا کے معاملے میں قرآن کریم نے بتایا ہے کہ اس قوم کی اچھی بھلی زراعتی اکانومی (معیشت) تھی، ان کی زراعت کے بڑے اچھے باغات تھے، لہلاتی ہوئی بڑی عمدہ کھیتیاں تھیں۔ انہوں نے ڈیم بنا رکھے تھے، ان میں وہ پانی اسٹور کرتے تھے، ان سے یہ سارا کچھ ہوتا تھا، بڑی خوشحال قوم تھی۔ قرآنِ حکیم کہنے لگا کہ ان میں جو ہوس آئی تو انہوں نے کہا کہ صاحب! یہ دور دراز تک ہم باہر کیوں نہ چلے جائیں مثال کے طور پر ابوظہبی میں اور قطر میں کیوں نہ چلے جائیں تو انہوں نے تجارت کے لمبے لمبے راستے اختیار کر لیے اور وہ ڈیم اسی طرح کمزور رہنے دیئے اور یہ آپ لگ گئے اس ہوس کے اندر۔ باہر جانے لگ گئے، ڈیم کی مرمت نہ کی، یہ ایک دم جو ایک ہلہ آیا ہے، اس نے بند توڑ کر رکھ دیئے تو کہنے لگے کہ وہ ہلّہ سارے کا سارا ہی بہا کر لے گیا اور یہ اس تجارت میں لگے رہے۔ یہ بتاتا ہے قرآن حمید۔ یہ تھے وہ ارم کے لوگ!

قومِ مسلم کی عملی تفسیر اور اس کا سدِ باب

عزیزانِ من! یہ وہ جرائم تھے جن کی وجہ سے یہ قومیں ان طریقوں سے تباہ ہوتی تھیں۔ یہ کوئی معجزے کی بات نہیں ہے۔ یہاں تو ہر بات قانون کے مطابق ہوتی ہے۔ یہ تباہیاں بھی قانون کے مطابق آتی ہیں۔ ان سے بچا جا سکتا ہے اگر حفاظت کے سامان کر لو۔ حفاظت کے سامان کرنے کی صورت میں وہ کہتا ہے کہ یہ ہوتے ہیں۔ جب اربابِ نظام ہر وقت اس فکر میں رہیں کہ قوم کس طرح سے محفوظ رہ سکتی ہے، تباہیوں سے کس طرح حفاظت کا سامان بہم پہنچایا جا سکتا ہے، وہ اپنے آپ کو اس چیز میں لگائے رکھیں تو فطرت کی طرف سے یہ چیزیں آتی نہیں ہیں لہٰذا آج بھی جن قوموں نے اپنے انتظام کر رکھے ہیں، وہ آپ دیکھیے کیسے بچے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہی حال ہے، ان [1] کے پاس چپہ بھر زمین نہیں ہے، وہ سمندر کو پیچھے دھکیل کر لیے جاتے ہیں اور وہاں انہوں نے تختوں سے بند لگائے ہوئے ہیں کہ کہیں پانی نہ آنے پائے اور ایک مملکت بسا رکھی ہے۔ وہ سمندر کے پانی کو نہیں آنے دیتے۔ ساڈے کولوں لئی دا نالہ جیہڑا ہیگا اے راولپنڈی دا، او سنبھالیا نئیں جاندا (ہمارے ہاں راولپنڈی میں جو لئی کا نالہ ہے وہی سنبھالا نہیں جاتا)۔ اس سے کیپٹل سٹی تباہ ہو گیا ہے۔ ہم نے کہا کہ وہاں کونسا دریا ہے، ہم نے تو دیکھا ہے کہ دریا بھی کچھ نہیں ہے۔ کہنے لگے: جی! ایک نالہ بہتا ہے شہر کے بیچوں بیچ، وہ نالہ بہہ کر تباہ کر گیا۔ میں نے کہا کہ جس قوم کو نالہ تباہ کر کے لے جائے، اگے کہن والی گل ای نئیں خدا حافظ خدا کیویں حافظ ہو سکدا اے۔ (جس قوم کو نالہ تباہ کر کے رکھ دی تو پھر وہاں آگے کچھ کہنے کے لیے بچتا ہی نہیں ہے تو پھر ان کا خدا کیسے حفاظت کرنے والا ہو سکتا ہے)۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ الذّٰریٰت کی آیت 47 تک آ گئے، 48 ویں آیت سے پھر آ گے لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ﴿۱۲۷﴾ (2:127)

(حواشی وادارت ڈاکٹر منظور احمد)

[1] یہ اشارہ ہالینڈ کی طرف ہے۔

منظور حسین لیل، بھکر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پرویز صاحب کا نظریۂ قرآنِ کریم

تدبر فی القرآن

تدبر فی القرآن:

پرویز صاحب قرآن کریم میں تدبّر کے بارے میں کہتے ہیں۔ ''یہ سلسلہ قانونِ کائنات کے مطابق اپنی ارتقائی منازل طے کرتا ہوا بڑھتا چلا جائے گا۔ قرآن فہمی کا یہ سلسلہ نہ کسی دور میں ختم ہوسکتا ہے نہ کسی انسان تک پہنچ کر رک سکتا ہے۔ یہ ایک جوئے رواں ہے جو لامتناہی وسعتوں کا امکان رکھتی ہے۔ جوں جوں انسانی علم وسیع ہوگا قرآنی حقائق بیش از بیش بے نقاب ہوتے جائیں گے۔ یہ سلسلہ یوں ہی رہے گا۔ حتیٰ مطلع الفجر۔'' لہٰذا ''کسی ایک دور کے کسی ایک انسان کے تدبّر کو حرفِ آخر نہیں کہا جا سکتا۔ حرفِ آخر کا حق تو آخری انسان ہی کے لئے چھوڑنا ہوگا۔'' ''اے رسول! تم ان سے کہہ دو کہ علمِ خداوندی کی وسعتوں کا یہ عالم ہے کہ اگر سمندر روشنائی بن جائے (اور زمین کے تمام درخت قلمیں 37:27) اور سمندر کا پانی ختم ہو جائے لیکن میرے نشوونما دینے والے کے قوانین وحقائق کی تفصیلات ختم نہ ہوں، خواہ اس کے ساتھ اس جیسے اور سمندر کا بھی اضافہ کر دیا جائے۔'' (18:109)۔ قوانینِ کائنات کی لامتناہیت کے متعلق علومِ کائنات کے ماہرین ہی کچھ کہہ سکتے ہیں اور وہ آئے دن اس کا اعتراف بھی کرتے رہتے ہیں۔ علومِ قرآنی کی پہنائیوں کا یہ عالم ہے کہ اس باب میں بھی حرفِ آخر دنیا کے آخری انسان کے لئے چھوڑنا پڑے گا۔ یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ: سَنُرِيۡهِمۡ اٰيٰتِنَا فِى الۡاٰفَاقِ وَفِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمۡ اَنَّهُ الۡحَـقُّ ؕ ۔۔۔ (41:53)۔ ''ہم نوعِ انسان کو انفس وآفاق میں اپنی نشانیاں دکھاتے جائیں گے۔ تا آنکہ یہ حقیقت ان پر واضح ہو جائے کہ قرآن کا ہر دعویٰ مبنی بر حقیقت ہے۔'' اب ظاہر ہے کہ عالمِ انفس وآفاق کے مستور حقائق تو حدود نا آشنا ہیں۔ علمِ انسانی جوں جوں وسیع، عمیق اور بلند ہوتا جائے گا، زمانے کی لہروں میں لپٹے ہوئے حقائق بے نقاب ہوتے، اور اس طرح نت نئے عنوانات سامنے آتے جائیں گے۔'' (تبویب القرآن، جلد اول، مراحل تجسس)۔

ماہنامہ طلوعِ اسلام:

نومبر 2012ء، سرورق: ''پاکستان کی سپریم کورٹ نے ایک فیصلہ صادر فرمایا جو (P.L.D) کی اشاعت بابت اگست 1980ء میں شائع ہوا۔ اس میں ریٹائرڈ جسٹس محمد شفیع کے ایک فیصلے کا اقتباس بھی دیا گیا ہے، جس میں انہوں نے کہا تھا کہ یہ حقیقت واضح ہے کہ قرآن کریم کا پڑھنا اور سمجھنا کسی ایک یا دو افراد کی اجارہ داری نہیں۔ اسے آسان اور قابلِ فہم زبان میں

نازل کیا گیا تھا تاکہ جو مسلمان بھی کوشش کریں' اسے سمجھ سکیں اور اس پر عمل بھی کر سکیں۔ اس سے ثابت ہے کہ قرآن کے پڑھنے اور سمجھنے کا حق ہر مسلمان کو دیا گیا ہے' جسے کوئی شخص' خواہ وہ کتنے ہی بلند منصب پر فائز اور صاحبِ علم کیوں نہ ہو' اس سے چھین نہیں سکتا۔ قرآن کے سمجھنے کے لئے متقدمین کی تفسیروں سے صرف استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ قرآن کی تعبیر میں انہیں حرفِ آخر قرار نہیں دیا جاسکتا۔ قرآن کے پڑھنے اور سمجھنے سے مراد اس کی تعبیر ہے اور تعبیر سے مقصود یہ ہے کہ اس کے احکام کو حالاتِ حاضرہ کے تقاضوں اور دنیا کی بدلتی ہوئی ضرورتوں کی روشنی میں نافذ کیا جائے۔ اگر ان مفسرین کی تعبیرات کو' جو بارہ تیرہ سو سال پہلے ہو گزرے ہیں' حرفِ آخر سمجھ لیا جائے تو تمام مسلم معاشرہ ایک فولادی پنجرے میں محبوس ہو جائے گا اور اسے اس کی اجازت ہی نہیں ہوگی کہ وہ زمانے کے ساتھ نشو و نما پاسکے۔ اس سے اسلام ایک عالمگیر دینی نظام ہونے کی بجائے ایک ایسا مذہب بن کر رہ جائے گا جو اُسی زمانے تک محدود رہے گا جس میں وہ نازل ہوا تھا۔''

قرآنِ کریم کو سمجھنے کی شرط:

مطالب الفرقان، جلد اوّل، آغازِ سخن: ''قرآن کریم کے سمجھنے کی ایک شرط تدبر فی القرآن ہے (4:82)۔ یعنی اسے غور و فکر' عقل و بصیرت اور علم و شعور کی رو سے سمجھنا۔ تدبر فی القرآن کا حکم نہ کسی خاص فرد کے لئے ہے' نہ کسی خاص زمانے کے لئے۔ وہ تمام افراد کے لئے ہے' اور ہر زمانے کے لئے۔ اس لئے قرآن مجید کو نہ تو تقلیداً سمجھا جا سکتا ہے' نہ کسی اور کا فکر و تدبر' دوسرے کے لئے سند و حجت ہوسکتا ہے۔ دوسروں کے تدبر سے استفادہ کیا جاسکتا ہے' کہ علم نوعِ انسان کی وراثت ہے' لیکن نہ وہ سند ہوسکتا ہے' نہ حرفِ آخر۔

تدبر فی القرآن کے سلسلہ میں' خدا نے یہ بھی کہا ہے کہ: سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۗ (41:53)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جوں جوں اَنفس و آفاق (خارجی کائنات اور خود نفسِ انسانی) میں پوشیدہ حقائق بے نقاب ہوتے جائیں گے' قرآنی دعاوی کی صداقت نکھر کر سامنے آتی جائے گی۔ لہٰذا' قرآن کریم پر غور و تدبر کرنے والے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے زمانے میں علمِ انسانی جس سطح پر پہنچ چکا ہے' اس پر بھی اس کی نگاہ ہو۔ قرآن' انسانی زندگی کے تقاضوں کا حل پیش کرتا ہے۔ اگر کسی کو یہی معلوم نہ ہو کہ اس کے زمانے کے انسانی تقاضے کیا ہیں' اور انسانی فکر کی کاوشیں ان کے متعلق کس نتیجہ پر پہنچی ہیں' تو وہ قرآن سے راہنمائی کیا حاصل کر سکے گا؟۔ تدبر فی القرآن کے ضمن میں ایک اور نکتہ بھی سمجھ لینے کے قابل ہے۔ قرآن کریم میں کچھ تو احکام و قوانین دیئے گئے ہیں اور کچھ حقائق۔ احکام و قوانین ایسے الفاظ میں بیان کئے گئے ہیں جن کے معانی متعین ہیں۔ لیکن حقائق' بالخصوص وہ حقائق جن کا تعلق مابعد الطبیعیات سے ہے' انہیں تشبیہات' تمثیلات اور استعارات کے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ مجرد حقائق (Abstract Realities) کو بیان ہی اسی انداز میں کیا جاسکتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ تشبیہات و استعارات سے ان حقائق سے متعلق' ہر صاحبِ فکر' اپنے فہم اور علمی سطح کے مطابق تصور قائم کر سکتا ہے۔ بناء بریں' ان تصورات میں فکری اختلاف قابلِ فہم ہے۔ لیکن جہاں تک قرآنی احکام یا راہنمائی کا تعلق ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہوسکتا۔ قرآنی راہنمائی کی بھی یہ صورت ہے کہ اس

میں بعض احکام متعین ہیں اور بعض اصول واقدار کی شکل میں۔ جہاں تک اصول واقدار کا تعلق ہے، ان کی عملی جزئیات قرآن کریم نے خود متعین نہیں کیں، انہیں اسلامی مملکت پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان پر عمل پیرا ہونے کے طریق وضع کرے۔ اس طرح اُمت میں وحدت فی العمل پیدا ہوگی اور برقرار رہے گی۔ قرآن فہمی کے سلسلہ میں اس اہم حقیقت کا پیشِ نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔

تدبر فی القرآن کے سلسلہ میں ایک بنیادی شرط ۔۔۔۔۔ یہ بھی ہے کہ جب تک آپ اپنے ذہن کو پہلے سے قائم شدہ نظریات، معتقدات اور تصورات سے پاک نہیں کرلیں گے قرآن کریم کا صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آسکے گا (۵۶/۷۹)۔ جو شخص پہلے سے کوئی خیال قائم کرکے، قرآن کی طرف اس لئے آتا ہے کہ اُسے اپنے خیال کی سند اور تائید قرآن سے حاصل ہو جائے، اس کی رسائی صداقت تک نہیں ہوسکتی۔''

تطہیرِ فکر ونظر:

ماہنامہ طلوعِ اسلام فروری 1983ء، ص:56:۔ لَّا يَمَسُّهُۥٓ إِلَّا ٱلۡمُطَهَّرُونَ (56:79) 'قرآن کا واضح ارشاد ہے۔ یعنی جس کے قلب ونگاہ، انسانی خیالات کی آمیزشوں سے پاک نہ ہوں، اسے قرآن سے کوئی مس نہیں ہوسکتا۔ انسانی قلب خدا کا مسکن بن نہیں سکتا جب تک اس حریمِ کعبہ سے انسانی فکر کے تراشیدہ بتوں کو نکال باہر نہ کیا جائے۔ جو شخص پہلے سے کوئی خیال قائم کرکے (یعنی شیعہ، سنی، اہل قرآن، اہل حدیث وغیرہ بن کر) قرآن کی طرف اس لئے آتا ہے کہ اُسے اپنے اس خیال کی (کسی نہ کسی طرح) تائید مل جائے، اُسے قرآن کی بارگاہ سے بری طرح پھٹکار پڑتی ہے۔ اقبال کے الفاظ میں۔

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے   ترے دماغ میں بت خانہ ہوتو کیا کہئے

بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ اہل عرب کی زبان تو عربی ہے، وہ بھی قرآن کو صحیح طور پر کیوں نہیں سمجھ پاتے؟۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بھی قرآن کو (غیر عرب مسلمانوں کی طرح) تقلیداً سمجھتے ہیں۔ یعنی کسی زمانے میں کسی مفسر نے جس طرح قرآن کو سمجھا، وہ آنے والوں کے لئے سند اور حجت بن گیا۔ اس کے بعد یہ سوال ہی نہ رہا کہ قرآن میں خود غور وفکر کیا جائے۔ یہ تقلیدی قرآن، عربوں کو عربی زبان میں پڑھایا جاتا ہے اور غیر عربوں کو ترجموں کے ذریعے اُن کی اپنی زبان میں۔ اپنی فکر سے نہ یہ قرآن کو سمجھتے ہیں نہ وہ۔ اس لئے اس باب میں عرب اور عجم کی کوئی تفریق ہی نہیں رہی۔ تفسیر کی جو کتابیں الازہر میں پڑھائی جاتی ہیں، وہی دیوبند (یا اب کراچی، ملتان اور لاہور کے دارالعلوموں) میں زیرِ تدریس رہتی ہیں۔ اپنی فکر وبصیرت نہ یہاں ہے نہ وہاں۔ قرآن سمجھنے کا سوال، اہلِ زبان ہونے کا نہیں۔ سوال زبان دانی کے بعد، اہلِ فکر ونظر ہونے کا ہے۔'' آگے اس کی مزید وضاحت آرہی ہے۔

قرآن کی زبان:

لغات القرآن، حصہ اوّل، پیش لفظ: ''قرآن کریم خدا کی آخری کتاب اور نوعِ انسان کے لئے واحد اور مکمل ضابطہء حیات ہے۔ یہ ایسے ابدی حقائق پر مشتمل ہے جن پر زمانہ کے تغیرات اثر انداز نہیں ہوسکتے' اور جو اس قدر عالمتاب اور

ہمہ گیر ہیں کہ زندگی کے ہر شعبے اور تاریخ کے ہر دور میں انسانی فکر کی امامت کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس کتاب کی کیفیت یہ ہو اس کی زبان کو کس قدر جامع، ہمہ گیر، وسیع، بلند اور عمیق، اور اس کے ساتھ، کس قدر صاف، واضح اور متعین ہونا چاہیئے۔ ایک مغربی مفکر نے۔ جو عیسائیت سے برگشتہ ہو کر ایک ایسے مذہب کی تلاش میں ہے جو انسانی عقل و بصیرت کی تسکین کر سکے۔ کہا ہے کہ وہ جس مذہب کی تلاش میں ہے اس کی کتاب کی زبان ایسی ہونی چاہیئے:۔ جو ایک طرف ایسی سلیس اور سادہ ہو کہ عام سطح کے انسان بھی اس سے مستفید ہو سکیں اور دوسری طرف اس قدر عمیق اور پُر معنی کہ ایک بلند پایہ مفکر بھی اس سے مطمئن ہو جائے (Julian Huxley.N.Y.Times-22.8-1952)۔ قرآن کریم کی زبان اس معیار پر بھی پوری اترتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب مشیتِ ایزدی نے قرآن کے انقلابی پروگرام کو عملاً متشکل کرنے کے لئے عربوں جیسی قوم کا انتخاب کیا تو، نزولِ قرآن سے صدیوں پہلے، اس قوم کے ذمے یہ فریضہ عائد کر دیا کہ وہ اپنی زبان کو بتدریج ارتقائی منازل طے کراتے اس مقام تک لے جائے کہ وہ قرآن کے عظیم حقائق کی متحمل ہو سکے۔''

جامعیت:

قرآن کریم ہر لحاظ سے ایک مکمل اور جامع کتاب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں نہیں ہو سکتا۔ اس کا صرف مفہوم بیان کیا جا سکتا ہے پرویز صاحب نے ''مفہوم القرآن'' کے تعارف میں لکھا ہے۔ ''حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کا ترجمہ، خواہ وہ دنیا کی کسی زبان میں بھی کیوں نہ ہو، قرآنی مفہوم کو واضح کر ہی نہیں سکتا۔ حتیٰ کہ اگر قرآن کریم کے الفاظ کی جگہ خود عربی زبان کے دوسرے الفاظ رکھ دیئے جائیں تو بات کچھ سے کچھ ہو جائے گی۔ قرآن کریم کا انداز اور اسلوب نرالا ہے۔ یہ اپنی مثال آپ ہے۔ الفاظ تو اس کے عربی زبان ہی کے ہیں لیکن ان میں جامعیت اس قدر ہے کہ نہ ان الفاظ کی جگہ دوسرے الفاظ لے سکتے ہیں اور نہ ہی ان کی ترتیب میں ردو بدل کرنے سے وہ بات رہ سکتی ہے۔ اس لئے قرآن کریم کے ترجمہ میں اس کا پورا پورا مفہوم نہیں آ سکتا۔''

قرآن کا ترجمہ نہیں ہو سکتا:

طلوعِ اسلام مارچ 1984ء، ص:20:۔ ''خدا نے جہاں بنی اسرائیل کو نبوت و حکومت کے لئے منتخب کیا تھا، دوسری طرف بنی اسرائیل کے ذمے (گویا) فریضہ عائد کر دیا تھا کہ وہ عربی زبان کو اس حد تک (Develop) کریں کہ وہ خدا کے آخری پیغام کے اظہار کا ذریعہ بن سکے۔ یہ ہے وہ عربی زبان جس کے ان الفاظ میں جنہیں خود خدا نے منتخب کیا، قرآن نازل ہوا۔ اس کے بعد آپ خود ہی فیصلہ کر لیجئے کہ کیا قرآن کے الفاظ کا بدل کوئی اور الفاظ ہو سکتے ہیں؟۔ بدل ہونا تو ایک طرف، قرآن کا تو لفظی ترجمہ بھی ایسا نہیں ہو سکتا جو اس کے پورے مفہوم کو ادا کر سکے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کا اعتراف غیر مسلم محققین تک نے کیا ہے۔ چنانچہ پروفیسر گِب (H.A.R.Gib) اس باب میں لکھتے ہیں:۔ ''جس طرح ایک بلند پایہ شعر کا ترجمہ کسی زبان میں نہیں کیا جا سکتا، قرآن کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ایک ملہم اپنے الہام کو عام زبان میں ادا کر ہی نہیں سکتا (اس کا انداز و اسلوب ہی جداگانہ ہوتا ہے جس میں) اس کے الفاظ اس طرح بکھرے ہوئے ہوتے ہیں جس

طرح (کسی حسین وجمیل) تصویر کومختلف ٹکڑوں میں منتشر کر دیا جائے۔ظاہر ہے کہ ان ٹکڑوں سے اصل تصویر کو سامنے لانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی ہر لکیر کے پیچ وخم اور اس کے رنگوں کے لطیف اور نازک فرق کا' ایک طویل مدت تک' نہایت غور وخوض سے مطالعہ کیا جائے۔لیکن یہ معاملہ تصویر کے خطوط والوں ہی کا نہیں' بات اس سے کہیں آگے ہے۔قرآن کے الفاظ کا صوتی اثر بھی ایسا ہے کہ سننے والے کے دل کو اس کے پیغام کی معنویت سے ہم آہنگ کرنے میں' اس کی موسیقی کا بڑا ہی عمل دخل ہے۔ایسا عمل دخل جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ایسی کتاب کو دوسرے الفاظ میں پیش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس کی اصل صورت کو مسخ کر رہے ہیں۔آپ سونے کی جگہ مٹی کے ڈھیلے رکھ رہے ہیں۔آپ زمین کی دلدل میں پھنسی ہوئی بوجھل عقل کو لاہُوتی فضاؤں میں اُڑنے والے شاہین وحی کا مقام عطا کر رہے ہیں۔آپ قرآن کا انگریزی زبان میں ترجمہ کرتے ہیں!۔آپ کو معلوم ہے کہ اس سے آپ کرتے کیا ہیں؟۔آپ عربی زبان کی ان تراکیب کی جگہ' جو ترشے ہوئے جواہرات کی طرح مختلف پہلو رکھتی ہیں' ایسے الفاظ لے آتے ہیں جن کا مفہوم متعین ہوتا ہے اور جو محض اس جگہ ٹھونس دیئے جاتے ہیں۔اور اگر یہ ترجمہ لفظی ہے تو یہ اور بھی بے رنگ اور پھیکا ہوتا ہے۔قرآن کے جو حصے قصص یا احکام سے متعلق ہیں' ہوسکتا ہے کہ ان میں یہ کمی زیادہ نقصان دہ نہ ہو' اگرچہ جب ان حصوں کا بھی لفظی ترجمہ سامنے آئے گا تو پڑھنے والا سمجھے گا کہ یہ تو ایک عجیب بے ربط اور ناہموار سی کتاب ہے۔اور اگر اس ترجمہ میں آپ کہیں قرآن کی جمالی نزاکتوں اور جلالی ضرب کاریوں اور خطابتی وقفوں کو بھی لے آئے (اگر ان کا کسی اور زبان میں منتقل کیا جانا ممکن ہو!۔) تو سامعین کے دل پر اس کا عجیب اضطراب انگیز بلکہ کارلائل کے الفاظ میں بے ہنگم سا اثر ہوگا۔(مثلاً) قرآن کی ایک سادہ سی آیت ہے: اِنَّا نَحۡنُ نُحۡیٖ وَ نُمِیۡتُ وَ اِلَیۡنَا الۡمَصِیۡرُ ﴿۴۳﴾ (50:43)۔انگریزی کیا' دنیا کی شاید کوئی زبان بھی ایسی نہیں جو اس شدت اور قوت کا مظاہرہ کر سکے جو ان چھ الفاظ میں پانچ مرتبہ ''ہم'' کے استعمال سے پیدا ہو رہی ہے۔(Modern Trends in Islam-p/4)''۔یہ ہے قرآن کے الفاظ کی اہمیت اور ان کا مقام!۔آپ سوچئے!۔کہ اگر ان الفاظ کی جگہ کسی اور زبان کے الفاظ رکھ دیئے جائیں تو کیا یہ الفاظ قرآن کے اصل الفاظ کا بدل ہو سکتے ہیں یا وہ مقصد پورا کر سکتے ہیں جس کے لئے قرآن کے اصل الفاظ آئے ہیں؟۔اس کا تجربہ آپ ہر روز کرتے ہیں۔قرآن کے اپنے الفاظ' گِب جیسے غیر مسلم کے دل میں اثر و جذب کا ایک محشر برپا کر دیتے ہیں لیکن جب ہم (مسلمان) اسی قرآن کا ترجمہ پڑھتے ہیں تو اس سے ہمارے دل پر کس قدر اثر ہوتا ہے' اس کے متعلق ہم میں سے ہر ایک خود واقف ہے؛

ہمارے تراجم کا اثر:

اسے کسی دوسرے سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں۔مثال کے طور پر سورہ ءِ 'ق' کی اسی آیت کو لیجئے جسے گِب نے پیش کیا ہے۔وہ ان لفظوں میں پانچ مرتبہ ''ہم'' کے استعمال سے وجد میں آ رہا ہے۔اب آپ اس کا ترجمہ دیکھئے۔شاہ عبدالقادرؒ کا ترجمہ حسب ذیل ہے:۔تحقیق ہم جِلاتے ہیں اور مارتے ہیں اور طرف ہماری ہے پھر آنا۔انگریزی زبان میں خود گِب نے جو ترجمہ کیا ہے' وہ یہ ہے:۔.Verily,we give life and death and unto us is the journeying۔اس قسم

کے تراجم۔ مارماڈیوک پکتھل، محمد علی لاہوری اور یوسف علی کے ہیں۔ آپ غور کیجئے کہ کیا ان تراجم سے آپ کے دل پر وہی اثر مرتب ہوتا ہے جو اصل آیت سے عرب کے دل پر ہوا ہے؟ اس کی وجہ ہماری استعداد یا زبان کی کوتاہ دستی نہیں بلکہ قرآن کے نخلِ طیب کی بلندی ہے۔ اسی مشکل کے پیشِ نظر میں نے ''لغات القرآن'' کے بعد جب ''مفہوم القرآن'' کا کام ہاتھ میں لیا تو اس میں قرآنی آیات کا ترجمہ نہیں دیا بلکہ ان کا مفہوم بیان کیا ہے۔ یہ مفہوم بھی نہ تو کسی طرح اصل کا بدل ہوسکتا ہے، نہ ہی اس کی حیثیت مستقل قرار پاسکتی ہے۔ جب زمانہ کی علمی سطح اور بلند ہو جائے گی تو یہ مفہوم بھی ناکافی ہو جائے گا۔ اگر کسی دور کے ترجمہ کو سندِ دوام عطا کر دی جائے تو اس سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں وہ بالکل واضح ہیں۔ اس باب میں مشہور مورخ، ڈاکٹر ٹوِن۔ بی، اپنی کتاب (An Historian's Approach to Religion) میں لکھتا ہے:۔ عیسائیت اور اسلام نے جب اپنی آسمانی کتابوں کا ترجمہ فلسفہء یونان کی اصطلاحات میں کیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کتابیں بے جان اور بے روح ہو کر رہ گئیں۔۔۔ اس سے دوسری خرابی یہ پیدا ہوئی کہ زمانہء مابعد کی سائنٹفک تحقیقات نے جن صداقتوں کا انکشاف کیا وہ یونان کے فلسفہ اور مابعد الطبیعیات سے کہیں مختلف تھیں لہٰذا، ان آسمانی کتابوں کا یونانی ترجمہ ان کی صداقتوں کے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل ہو گیا۔ یونان کا فلسفہ ایک وقتی اور مقامی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے برعکس، یہ آسمانی کتابیں اپنی اصل شکل میں زمان کی قید سے ماوراء تھیں (ص:126)۔ لہٰذا، قرآن کا جو مفہوم بھی کسی ایک دور میں کیا جائے، وہ وقتی ہوسکتا ہے، ابدی نہیں ہوسکتا۔ ابدیت کی سند صرف قرآن کے اپنے الفاظ کو حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس کا بھی مخالف ہوں کہ قرآن کا ترجمہ بلامتن شائع کیا جائے۔ ترجمہ، متن کا بدل نہیں ہوسکتا۔

نماز، عربی میں:

ان تصریحات سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ نماز میں (یا کسی اور جگہ جہاں) قرآن کی آیات آنی چاہئیں، وہاں کوئی دوسرے الفاظ (خواہ وہ عربی زبان کے بھی کیوں نہ ہوں) نہیں لائے جاسکتے۔ اور چونکہ نماز میں قرآن پڑھا جاتا ہے اس لئے کسی اور زبان میں نماز، نماز نہیں کہلا سکتی۔''

عربی زبان:

''قرآن کریم کے متعلق کہا گیا ہے:۔ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ﴿۱۹۵﴾ (26:195)۔ ''اس کتاب کی زبان عربی مبین ہے۔ خود لفظِ ''عربی'' کے معنی بھی فصیح اور واضح کے ہیں۔ اور جب اس کے ساتھ ''مبین'' کا اضافہ کر دیا جائے تو اس کے واضح تر ہونے میں کیا شبہ رہ جاتا ہے۔ یہ کتاب واضح ہے اور: غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ (39:28)۔ ''اس میں کوئی پیچ وخم نہیں، ابہام نہیں، التباس نہیں۔''۔ صاف، نکھری، سیدھی، واضح کتابِ روشن۔ حتیٰ کہ قرآن کو ''نور'' بھی کہا گیا ہے۔ خود روشن اور دنیا کو روشنی عطا کرنے والی کتاب۔ یوں تو قرآن کی زبان عربی کے علاوہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی تھی کیونکہ خدا نے اصول یہ بتایا ہے کہ جس قوم کی طرف رسول بھیجا جاتا ہے، اس رسول کا پیغام اسی قوم کی زبان میں ہوتا ہے۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ کے اوّلین مخاطب عرب تھے، اس لئے قرآن انہی کی زبان میں آیا۔ لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مشیّت کا پروگرام کچھ ایسا تھا کہ وہ زبان جس میں

قرآن نازل ہونا تھا ایسی جامع، عمیق اور وسیع ہو کہ وہ قرآنی حقائق کی متحمل ہو سکے۔ علم الالسنہ کے ماہرین بتاتے ہیں کہ اس باب میں دنیا کی کوئی زبان عربی زبان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

(ماہنامہ طلوعِ اسلام فروری 1983ء، صفحہ نمبر:55 پر مزید لکھا ہے کہ:۔ جب حضرت ابراہیم اپنے بیٹے (حضرت اسمٰعیل) کو ذبح کرنے کے لئے آمادہ ہو گئے تو خدا نے انہیں، بیٹے کے حلق پر چھری چلانے سے روک دیا اور کہا کہ ہم اسے ایک عظیم قربانی کے لئے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ حضرت اسمٰعیل، حضرت ابراہیم کے بڑے بیٹے تھے اور باپ کی مملکتِ عظیم کا اُنہی کو وارث ہونا تھا۔ لیکن حکم یہ دیا گیا کہ انہیں حجاز کی وادی ءغیر ذی زرع میں بسا دیا جائے (جو کہ ایک عظیم قربانی تھی) تا کہ یہ وہاں خانہ ءخدا کی تولیت (جس کے لئے مزید عظیم قربانیوں کی ضرورت تھی) کا فریضہ سرانجام دیں۔ اور مملکتِ شام کی سرداری حضرت اسحاق کو دے دی جائے۔ اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت اسحاق کی اولاد (بنی اسرائیل) امورِ جہانبانی میں مصروف رہی۔ اس کے حصے میں شوکتِ سلیمانی اور سطوتِ داوٗدی آئی۔ لیکن بنی اسمٰعیل اسی وادی ءغیر ذی زرع میں نہایت سادہ زندگی بسر کرتے رہے۔ انہوں نے نہ کوئی حکومت قائم کی اور نہ ہی کسی تہذیب وتمدن کی بنا ڈالی۔ یہ ایک ہی کام کرتے رہے۔ یعنی عربی زبان کی تشکیل، تعمیر اور تہذیب۔ انہوں نے اس زبان کو اس مقام پر پہنچا دیا کہ دنیا کی کوئی زبان اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکتی)۔ ڈاکٹر (Bucke) نے اپنی کتاب (Cosmic Consciousness) میں مشہور مستشرق (Max Muler) کی تحقیقات کے حوالے سے لکھا ہے کہ جس زمانے میں تمام انڈو یوروپین زبانوں میں بنیادی تصورات (Root Concepts) کی تعداد ایک سو اکیس تک پہنچتی تھی، عربوں کے ہاں صرف اونٹ کے تضمنات میں پانچ ہزار سات سو چوالیس (5744) الفاظ موجود تھے۔ اس سے اس زبان کی وسعتوں کا اندازہ لگ سکتا ہے۔ یہ بڑی سائنٹفک زبان ہے۔ اس میں ایک مادہ (Root) ہوتا ہے۔ جو عام طور پر تین حرفوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس مادے کے معانی میں ایک بنیادی خصوصیت ہوتی ہے جو ان تمام الفاظ میں جھلکتی چلی جاتی ہے جو اس مادے سے مختلف ابواب میں بنائے جاتے ہیں۔ ان مادوں کی تعداد (25,000) کے قریب ہے۔

عربی آسان زبان ہے:۔ آپ اندازہ کر لیجئے کہ ان مادوں سے جو الفاظ بنیں گے ان کی تعداد کس قدر ہوگی۔ یہ تھی وہ زبان جس میں قرآن نازل ہوا۔ چونکہ یہ زبان بڑی سائنٹفک واقع ہوئی ہے اس لئے اس کا سیکھنا آسان ہے۔ یہ جو اس زبان کو ہوا بنا کر رکھ دیا گیا ہے تو یہ بھی ایک سازش ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ عام مسلمان قرآن کو براہِ راست سمجھنے نہ لگ جائیں اور اس طرح یہ خاص طبقے کی اجارہ داری نہ رہے۔ خود قرآن کے متعلق یہ کہہ دیا گیا کہ: وَلَقَدۡ يَسَّرۡنَا الۡقُرۡاٰنَ لِلذِّكۡرِ (54:17)۔ ''یہ حقیقت ہے کہ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے بڑا آسان بنایا ہے۔'' دوسری جگہ ہے: كِتٰبٌ فُصِّلَتۡ اٰيٰتُهٗ قُرۡاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ ۙ﴿۳﴾ (41:3)۔ ''یہ ایک ایسی کتاب ہے، جس کی آیات کو نکھار کر الگ الگ کر کے واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ قرآن ان لوگوں کے لئے جو علم وبصیرت سے کام لیں ایک واضح ضابطہء حیات بن گیا۔'' یہ: تِبۡيَانًا لِّكُلِّ شَىۡءٍ (16:89) ہے۔ ''یعنی جن امور کا ذکر اس میں کیا گیا ہے انہیں بڑی وضاحت سے کھول کر

بیان کیا گیا ہے۔'' (طلوعِ اسلام، دسمبر 1977ء، صفحہ نمبر: 29۔28)۔

عربی رسم الخط:

ظاہر ہے کہ کتاب لکھنے کے عمل سے مکمل ہوتی ہے۔ معزز قارئین کے لئے یہ امر خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ عربی رسم الخط نزول قرآن سے بہت پہلے وجود میں آ چکا تھا۔ طلوعِ اسلام اکتوبر 1970ء میں یہ معلومات پیش کی گئی ہیں۔ ''ہم نے فروری 1961ء کے طلوعِ اسلام میں محترم رحمت اللہ طارق (جو اس زمانہ میں دارالحدیث مکہ مکرمہ میں قیام پذیر تھے) کا ایک تحقیقاتی مقالہ شائع کیا تھا جس میں انہوں نے ثابت کیا تھا کہ عربی رسم الخط (نقاط کے ساتھ) زمانہ نزول قرآن سے قریب چار سو سال قبل ایجاد ہو چکا تھا۔ اور عہدِ رسالت مآب ﷺ میں حروف پر نقاط اور الفاظ پر اعراب وغیرہ (ضوابطِ تحریر) رائج تھے۔ انہوں نے اس سلسلہ میں اُس زمانہ کے دو مخطوطات کا بھی ذکر کیا تھا جن میں سے ایک 5ھ کی تحریر ہے اور دوسری 31ھ (عہدِ حضرت عثمانؓ) کی۔'' اس کے بعد طلوعِ اسلام نے حضرت معاویہؓ کے ایک مخطوطہ جو 58ھ کا ہے' بحوالہ ''ماہنامہ فکرونظر'' اسلام آباد (اپریل 1970ء) زیر عنوان ''عربی رسم الخط کا آغاز اور ارتقاء'' کا ذکر کیا ہے (صفحہ نمبر: 79)۔ اس سے ان غلط معلومات کا بھی ازالہ ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم پر نقاط و اعراب بعد میں (حجاج بن یوسف وغیرہ) نے لگوائے تھے۔ پرویز صاحب قرآن کریم کے بارے میں اس قسم کے نظریات کو قرآن کریم کے خلاف سازش قرار دیتے ہیں اور اس قسم کے پروپیگنڈہ کو غلط قرار دیتے ہیں کہ نقطوں اور اعراب کے سلسلے میں کتاب اللہ عراق کے دو غیر معروف عالموں کی صوابدید کی رہینِ منت ہے۔ یہ قرآن کریم کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کی ایک کوشش کے سوا کچھ نہیں۔ (طلوعِ اسلام، فروری 1978ء، صفحہ نمبر: 17۔16)۔

تعیّنِ مفہوم (تفسیرِ قرآن)

تفہیمِ قرآن:

طلوعِ اسلام، دسمبر 1977ء، صفحہ نمبر: 22: ''قرآنی حقائق کو ہر دور کے انسانی علم کی سطح تک سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ تو اُن حقائق کے متعلق ہے جنہیں قرآن کریم نے اپنے دعاوی کی تائید میں استعارات کے انداز میں بیان کیا ہے۔ جس کتاب کو زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہونا تھا اس کے حقائق کو تشبیہات و استعارات کے انداز ہی میں بیان کیا جا سکتا تھا۔ جہاں تک انسانی زندگی کے لئے راہنمائی کا تعلق ہے' اسے قرآن نے متعین انداز میں بیان کر دیا ہے جس میں نہ ابہام ہے نہ اختلاف۔ وہ نہایت واضح' متعین اور صاف و سادہ ہے۔ جس سے نہایت آسانی سے مستفید ہوا جا سکتا ہے۔''

قرآن میں کوئی اختلافی یا باہم متضاد بات نہیں:

کسی کتاب میں اختلافات اور تضادات کا پایا جانا اُس کے غیر جامع اور نامکمل فلہٰذا من جانب اللہ نہ ہونے کی دلیل ہے۔ قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ اس میں کوئی اختلاف یا تضاد نہیں۔ اگر ہمیں اس میں کوئی تضاد نظر آتا ہے تو یہ ہماری نظر اور سمجھ کا قصور ہے۔

طلوعِ اسلام فروری 1983ء، صفحہ نمبر: 56: ''قرآن میں ہے: اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ

لَوَجَدُوۡا فِيۡهِ اخۡتِلَافًا كَثِيۡرًا ﴿۸۲﴾ (4:82)۔ ''کیا ان لوگوں نے قرآن میں تدبر نہیں کیا۔ اگر یہ خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یہ لوگ اس میں کئی اختلاف پاتے۔'' یعنی قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ اس میں کہیں اختلاف نہیں۔ اور یہ چیز اس کے منجانب اللہ ہونے کی ایک دلیل ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ قرآن کے الفاظ میں تو کوئی اختلاف نہیں لیکن اس کی تعبیرات (Interpretations) مختلف ہوسکتی ہیں۔ آپ سوچئے کہ لفظی اختلافات کا نہ ہونا بھی کوئی ایسی خصوصیت ہے جس کا اس تحدی سے ذکر کیا جاتا؟ ساری بات تو تعبیرات کی ہے۔ اگر کسی کتاب کی عبارت کی کیفیت یہ ہو کہ وہ زید کو کوئی مفہوم دے اور بکر کو اس سے بالکل متضاد مفہوم' تو کیا اہل علم کے نزدیک اس کتاب کی کوئی وقعت ہوسکتی ہے؟ قرآن سمجھنے کے لئے جو شرائط قرآن نے مقرر کی ہیں' اگر ان کے مطابق قرآن میں تدبر کیا جائے تو اس کے کسی حکم کی دو تعبیریں ہو ہی نہیں سکتیں۔ اس مقام پر ایک نکتے کی وضاحت ضروری ہے۔ قرآن کریم میں کچھ تو احکام وقوانین دیئے گئے ہیں اور کچھ حقائق۔۔ احکام وقوانین کے لئے ایسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جن کے معانی متعین اور ٹھوس (Concrete) ہیں۔ لیکن حقائق۔۔ بالخصوص وہ حقائق جن کا تعلق مابعد الطبیعیات سے ہے۔۔ انہیں تشبیہات کے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اور اہلِ علم سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ تشبیہات واستعارات سے ہر شخص اپنے اپنے فہم اور علمی سطح کے مطابق مشبہ بہ کے متعلق تصور قائم کرسکتا ہے۔ ان تصورات میں اختلاف ہوگا۔ لیکن جہاں تک قرآنی ہدایات کا تعلق ہے ان کی دو تعبیریں نہیں ہوسکتیں۔ یہ احکام وقوانین اسلامی نظام کی طرف سے نافذ ہوں گے' اس لئے ان کی عملی جزئیات میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہوگا۔ یوں اُمت میں وحدت فی العمل پیدا ہوجائے گی' اور قرآنی حقائق سمجھنے کے لئے فکری آزادی بھی برقرار رہے گی۔''

تعبیراتِ قرآن میں اختلاف:

طلوعِ اسلام اگست 1973ء میں پرویز صاحب کا ایک انٹرویو شائع ہوا تھا جو کہ نمائندہ ہفت روزہ ''چٹان'' نے لیا تھا۔ جوابات تحریری تھے۔ صفحہ نمبر:35 پر قرآن کریم کی تعبیرات کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر ملاحظہ ہو: ''عام طور پر کہا جاتا ہے کہ قرآن کی بھی مختلف تعبیریں ہوسکتی ہیں' اس لئے غلط اور صحیح کے پرکھنے میں قرآنی معیار کے نتائج میں بھی فرق ہوسکتا ہے۔ اس قسم کے اعتراضات درحقیقت قرآن کو سند وحجت تسلیم نہ کرنے کے لئے گریز کی راہیں ہیں۔ قرآن کریم میں جو مابعد الطبیعیاتی حقائق آئے ہیں' ان کے سمجھنے میں تو انسانی فکر میں اختلاف ہوسکتا ہے' لیکن جن امور کا تعلق انسانی راہنمائی سے ہے (اور یہی قرآن کا بنیادی مقصد ہے) ان میں وہ بالکل واضح اور متعین تعلیم پیش کرتا ہے' جس کی مختلف تعبیریں ہو ہی نہیں سکتیں۔ بشرطیکہ قرآن کو خود اس کے تجویز فرمودہ طریق سے سمجھا جائے۔''

اس سلسلے میں طلوعِ اسلام مارچ 1978ء میں (صفحہ نمبر:65) پرویز صاحب مزید وضاحت کرتے ہیں: ''جب یہ کہا جاتا ہے کہ قوانین کی بنیاد قرآن مجید ہونی چاہیئے تو اس کے خلاف اعتراض یہ ابھارا جاتا ہے کہ قرآن کی کسی آیت کے قرآنی آیت ہونے میں تو کسی کو اختلاف نہیں ہوگا' لیکن اس کی تعبیر میں تو اختلاف ہوگا۔ چونکہ اس سوال کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے (بلکہ یوں کہئے کہ اسے یہ کہہ کر اچھالا جاتا ہے) کہ قرآن کریم قانون کی بنیاد بن ہی نہیں سکتا۔ اس لئے ضروری

معلوم ہوتا ہے کہ اس کے متعلق ذرا وضاحت سے بات کی جائے: (1) قرآن کریم نے اپنے منجانب اللہ ہونے کے لئے ثبوت یہ پیش کیا ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں سورۂ النساء میں ہے: (مفہوم)۔ ''کیا یہ لوگ قرآن میں غور وتدبر نہیں کرتے؟۔ اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یہ اس میں بہت اختلافات پاتے۔'' (4:82)۔ اس سے ظاہر ہے کہ دو مختلف باتوں کو قرآن کریم کی طرف سے سند یا تائید مل ہی نہیں سکتی۔ (2) اس نے کہا ہے کہ وہ آیا ہی اختلافات مٹانے کے لئے ہے: وَمَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخۡتَلَفُوۡا فِيۡهِ‌ۙ وَهُدًى وَّرَحۡمَةً لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ (16:64)۔ ''اور ہم نے تجھ پر یہ کتاب اس لئے نازل کی ہے کہ تو ان کے لئے وہ باتیں واضح طور پر بیان کر دے جن میں یہ اختلاف کرتے ہیں۔ (یوں) یہ قرآن ان لوگوں کے لئے ہدایت و رحمت ہے جو اس کی صداقتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔'' (3) وہ تاکید کرتا ہے کہ جس بات میں تمہیں اختلاف ہو اس کے لئے کتاب اللہ کی طرف رجوع کرو' تمہیں وہاں سے حتمی فیصلہ مل جائے گا: وَمَا اخۡتَلَفۡتُمۡ فِيۡهِ مِنۡ شَىۡءٍ فَحُكۡمُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ‌ؕ (42:10)۔ ''اور تم جس بات میں بھی اختلاف کرو' تو اس کا فیصلہ اللہ کی طرف سے لو۔'' (4) اس کی رو سے اختلاف خدا کا عذاب ہے۔ اس نے جماعت مومنین سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ: وَلَا تَكُوۡنُوۡا كَالَّذِيۡنَ تَفَرَّقُوۡا وَاخۡتَلَفُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَهُمُ الۡبَيِّنٰتُ‌ؕ (3:105)۔ ''اور تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے (خدا کی طرف سے) واضح ہدایت آ جانے کے بعد باہمی تفرقہ اور اختلاف کیا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے سخت عذاب ہے۔'' سوال یہ ہے کہ اگر قرآن کریم کے اس قدر حتمی اور یقینی دعاوی کے باوجود اس کی آیات کا ایسا مفہوم سمجھ میں ہی نہیں آ سکتا جس میں اختلاف نہ ہو' تو یہ کتاب نوعِ انسان کے لئے ابدی قوانین و ہدایت بن کیسے سکتی ہے؟ پھر تو اس کے تمام دعاوی (معاذ اللہ) باطل قرار پا جائیں گے۔ قرآن ایسی کتاب نہیں ہے۔ قرآن کریم نے اپنے سمجھنے کے لئے خود ہی اصول بیان کر دیئے ہیں۔ اگر قرآن کریم کو' خود قرآن کریم سے' اس کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق سمجھنے کی کوشش کی جائے تو اس کے احکام و قوانین کے سمجھنے میں کوئی اختلاف پیدا نہیں ہو سکتا۔''

اختلافاتِ تعبیر کا حل:

طلوعِ اسلام دسمبر 1983ء، ص:12: ''قرآن مجید کے احکام میں (Interpretation) یعنی تعبیر کا بھی فرق تو ہو گا۔ اس کا حل کیا ہو گا؟۔ یہ خیال اگر ابلہ فریبی نہیں تو بہت بڑی مغالطہ آفرینی پر مبنی ہے۔ قرآن کریم دو قسم کی آیات پر مشتمل ہے۔ ایک وہ جن کا تعلق حقائق و رموزِ فطرت سے ہے۔ قرآن کریم نے ان مضمر حقائق کو تشبیہات اور استعارات کے رنگ میں بیان کیا ہے اس لئے ان آیات کو متشابہات کہہ کر پکارا ہے۔ علمی تحقیق و تجسس سے ان حقائق کا مفہوم بے نقاب ہوتا جائے گا۔ ارشادِ خداوندی ہے: سَنُرِيۡهِمۡ اٰيٰتِنَا فِى الۡاٰفَاقِ وَفِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمۡ اَنَّهُ الۡحَقُّ‌ؕ (41:53)۔ ہم اربابِ دانش و بینش کو عالمِ انفس و آفاق میں اپنی نشانیاں دکھاتے جائیں گے تا آنکہ ان پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے کہ قرآن نے جو کچھ کہا ہے' صداقت پر مبنی ہے۔ یعنی جوں جوں علمِ انسانی بڑھتا جائے گا ان مستور حقائق پر پڑے ہوئے پردے اٹھتے جائیں گے اور ہر پردہ اٹھنے کے بعد جو حقیقت سامنے آئے گی وہ قرآن کے دعویٰ کی صداقت کی شہادت دے گی۔ ظاہر ہے

کہ ان آیات کی تعبیر (Interpretation) مختلف ادوار میں بھی مختلف ہوگی اور ایک ہی دور میں مختلف ارباب، فکر و تجسس کے ہاں بھی مختلف۔ یہ اختلاف فکری اور نظری ہوگا، انسان کی عملی زندگی سے متعلق نہیں ہوگا۔ انسان کی عملی زندگی کے متعلق آیات کو اللہ تعالیٰ نے محکمٰت کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی وہ احکام جن کا مفہوم متعین طور پر واضح کر دیا گیا ہے۔ قرآن کریم نے اپنے سمجھنے کا جو طریق بتایا ہے، اگر اسے اس طریق کے مطابق سمجھا جائے تو ان احکام کی تعبیر میں کوئی اختلاف نہیں ہوسکتا۔ قرآن کریم نے اپنے من جانب اللہ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی دی ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں: اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا كَثِیْرًا ﴿۸۲﴾ (4:82)۔ ’’کیا یہ لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے۔ اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بکثرت اختلافات پاتے۔‘‘ آپ خود صاحبِ فکر ہیں اس لئے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ قرآن نے جو کہا ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں، تو اس سے معنوی (یعنی تعبیر کا) اختلاف مراد ہے۔ لفظی اختلاف تو یونہی نظر آجاتا ہے، اس کے لئے غور و تدبر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ غور و فکر کی ضرورت، تعبیر یا مفہوم کے سمجھنے کے لئے ہوتی ہے۔ یہ تمام اختلافات جنہیں قرآن کی طرف منسوب کیا جاتا ہے (اور ایسا کرنے والے یہ نہیں سمجھتے کہ اس سے قرآن کا منجانب اللہ ہونے کا دعویٰ ہی معاذ اللہ باطل قرار پاجاتا ہے) ہماری غلط نگہی کا نتیجہ ہیں۔ جراءتِ عرض معاف ہو تو خود اپنی مثال پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا۔ میں گزشتہ (کم از کم) چالیس سال سے قرآن کریم کے متعلق لکھتا چلا آرہا ہوں۔ اور آپ بھی میری فکری کاوشوں کا مطالعہ کرتے چلے آرہے ہیں۔ کیا آپ کو آیاتِ محکمٰت کے مفہوم میں کہیں کوئی اختلاف نظر آیا ہے؟ یہ اختلاف اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب قرآن کے ساتھ خارج از قرآن عناصر کو ملا دیا جائے:

میرے ساقی نے عطا کی ہے مئے بے دُرد و صاف — رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے کا ہے

فقہ اور قرآن:

ماہنامہ طلوعِ اسلام مارچ 1978ء، ص: 66۔ ’’باقی رہے اہلِ فقہ (حنفی حضرات) تو ان کے ایک ممتاز اور مسلّم امام، ابوالحسن عبید اللہ الکرخی کا یہ قول ان کے عقیدہ کو واضح کرتا ہے کہ:۔ ’’ہر وہ آیت جو اس طریقہ کے مخالف ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں، وہ یا تو ماوّل ہے یا منسوخ ہے۔ اور اسی طرح جو حدیث اس قسم کی ہو وہ ماوّل یا منسوخ ہے۔‘‘ (علامہ الخضری، صفحہ نمبر: 421)۔ ان تصریحات کی روشنی میں یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ جس چیز کو قرآن کی تعبیر میں اختلاف کہا جاتا ہے وہ درحقیقت قرآن کی تعبیر کا اختلاف نہیں ہوتا بلکہ جن چیزوں کو مختلف فرقوں نے قرآن پر قاضی اور حاکم بلکہ اس کا ناسخ قرار دے رکھا ہے، وہ ان چیزوں کا اختلاف ہوتا ہے۔ اور یہ اختلاف ہوتا ہے فرقوں کی باہمی ضد کی وجہ سے۔ وَاٰتَیْنٰهُمْ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْۤا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۙ بَغْیًۢا بَیْنَهُمْ ؕ --- (45:17)۔ ’’اور ہم نے انہیں اس معاملہ (دین) کے متعلق واضح باتیں دی تھیں۔ لیکن انہوں نے العلم (وحی) آجانے کے بعد آپس میں اختلاف کیا۔ اور اس اختلاف کی وجہ محض ان کی باہمی ضد تھی۔‘‘ اگر فرقہ بندی کی باہمی ضد کو الگ رکھ کر، اُمت خالص قرآن کی طرف آجائے تو اس کے احکام و قوانین میں کسی قسم کا اختلاف نہیں رہ سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم نے

زندگی کے لئے جو ضابطہ عطا فرمایا ہے اگر وہ بھی صاف، واضح اور متعین نہیں تو پھر اس کے اس دعویٰ کا (معاذ اللہ) کچھ مطلب ہی نہیں کہ وہ نوعِ انسانی کے لئے صاف، واضح، مکمل، واحد اور آخری ضابطۂ حیات ہے۔''

اتھارٹی کے قیام کی تجویز:۔ تعبیرات کے اختلافات کو حل کرنے کے لئے پرویز صاحب نے ایک تجویز پیش کی تھی کہ۔ ''اسلامی نظام کی بنیادی شرط یہ ہوتی ہے کہ ایک ایسی اتھارٹی مقرر کر لی جائے جس کی قرآنی تعبیر ہر ایک کے لئے واجب التسلیم ہو۔ جب آپ اپنے آئین میں اس قسم کی شق رکھتے ہیں کہ آئین اور قانون کے معاملہ میں فلاں اتھارٹی کی تعبیر حرفِ آخر سمجھی جائے گی تو اس قسم کی شق قرآنی تعبیرات کو بھی محیط ہوگی۔ بالخصوص جب اسلامی نظام کی بنیاد ہی قرآن کریم ہوگا۔ اسلامی نظام میں اقتدارِ اعلیٰ (Sovereignty) حاصل ہی کتاب اللہ کو ہے کہ یہی کافر و مومن میں حدِ فاصل ہے۔ خدا کا واضح ارشاد ہے کہ:''جو کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، وہی تو کافر ہیں (5:44)۔'' (طلوعِ اسلام مئی 1970ء، ص:35)

تضادات کی ایک اور وجہ:

قرآن میں تضادات نظر آنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اب تک جو تفاسیر، روایات و تواریخ کی رو سے لکھی گئیں، ان میں مفسرین نے خود اپنی عقل و بصیرت سے بہت کم کام لیا۔ مفسرین کرام کو جو کچھ کتبِ روایات میں نظر آیا اسے ہو بہو نقل کر کے تفسیر لکھنے کا ثواب کما لیا۔ اس سے مفہوم قرآنی میں تضادات واقع ہو جاتے ہیں۔ پرویز صاحب ''مفہوم القرآن'' کے تعارف میں رقمطراز ہیں۔ ''کہا یہ جاتا ہے کہ قرآن کریم نبی اکرم ﷺ پر نازل ہوا، اور حضور ﷺ نے اسے صحابہؓ کی جماعت کو سمجھایا۔ ظاہر ہے کہ اس آسمان کے نیچے اس ذاتِ اقدس و اعظم ﷺ سے بہتر نہ تو کوئی قرآن کو سمجھانے والا ہو سکتا ہے اور نہ ہی قدوسیوں کی اس جماعت سے بہتر کوئی سمجھنے والا۔ اس لئے ہمیں قرآن فہمی کے سلسلے میں کسی اور طرف رُخ کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ (یعنی ہمیں حدیثِ رسول ﷺ کو قرآن کی تفسیر سمجھنا چاہیئے یا احادیث میں موجود تفسیرِ قرآن ہی کو بسلسلہ تفسیرِ قرآن حرفِ آخر تسلیم کرنا چاہئے)۔ یہ بالکل بجا اور درست ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جو کچھ حضور ﷺ نے سمجھایا تھا وہ اپنی اصلی و حقیقی شکل میں ہم تک نہیں پہنچا۔ اس کا واضح اور بین ثبوت یہ ہے کہ قرآن کریم کی جس تفسیر کو نبیءِ اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، وہ زبانِ حال سے کہہ رہی ہے کہ وہ حضور ﷺ کی حقیقی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ کتبِ روایات و تفاسیرِ سابقہ میں صحیح روایات کے ساتھ ساتھ ایسی روایات بھی گڈمڈ ہیں جن کا مضمون بتاتا ہے کہ وہ نبی اکرم ﷺ کی بیان فرمودہ تفسیر کا صحیح ریکارڈ نہیں ہو سکتیں۔ اگر صحیح بخاری یا صحاح ستہ میں سے کسی کتاب میں منقول تفسیری روایات کا مطالعہ کیا جائے تو بات واضح ہو جائے گی کہ ان روایات کی رو سے، جنہیں نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور جن کا مضمون غماز ہے کہ وہ نبی اکرم ﷺ کے ارشاداتِ گرامی نہیں ہو سکتے، قرآن کریم سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ کیونکہ اوّل اوّل تو خود ان کا صحیح ریکارڈ ہم تک نہیں پہنچا، دوسرے ان میں سے اکثر قرآن کی تعلیمات سے متصادم ہیں، اور ان روایات میں آپس میں بھی تضاد پایا جاتا ہے۔ جس سے واضح ہے کہ یہ وضعی ہیں۔'' پھر ان کی رو سے جو تفاسیر لکھی گئی ہیں ان تفاسیر میں متضاد تعلیمات اور باتیں جمع ہو گئی ہیں۔ علاوہ ازیں، ایک تفسیر دوسری تفسیر سے متصادم ہے۔ ان تفاسیر کا باہمی اختلاف و تضاد اور بھی زیادہ بڑھ گیا ہے۔ اور اب تو اس روش سے بھی ہٹ کر جو تفاسیر لکھی جا رہی ہیں وہ کسی قاعدے، کلیے کے بغیر، اپنی اپنی

فقہ اپنے اپنے عقائد اپنی اپنی پسند خیالات، رُجحانات وتعصّبات کی رو سے لکھی جا رہی ہیں (مؤلف)۔

کس کی تفسیر صحیح ہے:

یہیں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر قرآن کو کس طرح سمجھا جائے؟۔قرآن فہمی کا کیا اصول اور طریقہ ہونا چاہئے؟۔کس مفسّر کی تفسیر کو صحیح اور کس کی تفسیر کو غیر صحیح مانا جائے؟ اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ تفسیر کے لئے جو طریق خود قرآن کریم بتائے اور اس طرح جو مفہوم متعین ہو اسی کو صحیح تسلیم کیا جائے۔قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ یہ کتاب (قرآن) تمام نوعِ انسانی کی راہنمائی کے لئے کافی ہے (29:51) اس کی موجودگی میں کسی دوسری راہنمائی کی ضرورت نہیں پڑتی۔پھر فرمایا کہ قرآن جگمگاتا ''نور'' ہے (4:175) ظاہر ہے کہ نور روشن ہوتا ہے۔اور اس کی موجودگی میں دوسری چیزیں بھی صاف نظر آتی ہیں۔یہی کیفیت قرآن کریم کی ہے کہ وہ واضح کھلا ہوا اور روشن ہے۔اس کی روشنی میں دیگر حقائق بھی صاف نظر آتے ہیں۔قرآن اپنے مطالب خود ہی بیان کر دیتا ہے۔اس کے مطالب کی تلاش کے لئے کسی دوسری روشنی کی ضرورت نہیں۔

اپنی تفسیر آپ:

یہ اپنی تفسیر خود ہی کر دیتا ہے۔اسی لئے جگہ جگہ قرآن کو ''مفصّل کتاب''، یعنی کھلی ہوئی، تفسیر شدہ اپنی تشریح وتفسیر آپ کرنے والی کتاب کہا گیا ہے۔''اور وہی اللہ ہے جس نے تمہاری طرف کتاب اتاری (مفصّل) تفصیل شدہ'' (6:115) ''جس میں ہر شے کی تفصیل ہے'' (12:111) ''اور یہ ہر شے کی تشریح ہے'' (16:89) قرآن کریم کی تفسیر وتشریح کی ذمے داری بھی خود خداوند کریم نے لے لی۔''پھر اس کا جمع کرنا اور اس کی وضاحت وتشریح بھی ہمارے ذمے ہے'' (75:19) ''ہم ان کے لئے ایک ایسی کتاب لائے جس کی تفصیل وتشریح ہم نے علم کے ساتھ کی ہے (7:52، 11:1) قرآن کریم شاہد ہے کہ اس آخری وحی (قرآن کریم) کے جمع کرنے اس کی تفصیل، تشریح وتفسیر اور اس کی حفاظت کی ذمے داری خود خدا نے لے لی۔

قرآن فہمی کا طریق:

یہ جو آپ اس وقت مختلف فرقوں میں اختلافات دیکھتے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ قرآن کریم ان میں سے ہر ایک کو اس کے مسلک کی تائید بہم پہنچا رہا ہے۔اگر ایسا ہو تو قرآن کے منجانب اللہ ہونے کا دعویٰ ہی (معاذ اللہ) باطل قرار پا جائے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف فرقے قرآن کریم کو خارج از قرآن چیزوں کے تابع رکھتے ہیں۔یعنی یہ فرقے اپنے اپنے عقائد مسالک اور احکام کو حتمی، یقینی اور غیر متبدل قرار دیتے ہیں۔اس کے بعد وہ قرآن کی طرف آتے ہیں۔اگر انہیں ان احکام وقوانین کی تائید میں قرآن کی کوئی آیت مل جاتی ہے تو اسے بھی تائیداً ساتھ رکھ لیتے ہیں۔اگر قرآن کی آیت اس کے خلاف جاتی ہے تو اس آیت کی تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ وہ اس حکم کے مطابق دکھائی دے۔اور اگر ایسا ناممکن ہو تو پھر کہہ دیتے ہیں کہ قرآن کا حکم منسوخ ہے۔آپ متبعین حدیث کا یہ عقیدہ (نظریہ حدیث میں) دیکھیں گے کہ حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔

تعینِ مفہوم کا فارمولا:

اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری کتاب کی تشریح وتفسیر اور وضاحت کا طریقہ یہ بتایا ہے کہ کسی بات کی وضاحت مقصود ہو تو اسے بار

بارسامنے لانے سے مقصد حاصل ہوجائے گا۔قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔’’اور اسی طرح ہم آیتوں کو پھیر پھیر کر سامنے لاتے ہیں تاکہ وہ کہہ دیں کہ تُو نے پڑھ کر سُنا دیا۔اور ہم اہلِ علم کے لئے وضاحت کردیں‘‘(6:106،17:41،17:89)اس قرآنی طریق کو پرویز صاحب ’’تصریفِ آیات‘‘ (یعنی وضاحت اور تشریح وتفسیر کے لئے آیات کو پھیر پھیر کر سامنے لانا) کہتے ہیں۔انہی آیات پر غور کرنے کے بعد پرویز صاحب اس نتیجے پر پہنچے کہ قرآن کریم کی تفسیر خود قرآن کریم ہی سے کرنا قرآن کریم کا اصل منشاء ہے اور یہ منشاء ’’تصریفِ آیات‘‘ کے فارمولے کو استعمال کرنے سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

قرآن کا انداز:

’’قرآن کریم کا صرف مفہوم منجانب اللہ نہیں‘ اس کے الفاظ بھی منجانب اللہ ہیں۔اسی بناء پر اسے کلام اللہ کہا گیا ہے(9:6)۔قرآن کریم کا انداز عام کتابوں کا سا نہیں‘ عام کتابوں کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کتاب‘ مختلف ابواب میں تقسیم کردی جاتی ہے۔ ہر باب کا خاص موضوع ہوتا ہے اور اس موضوع سے متعلق تمام مضامین اس باب میں مربوط طور پر درج کر دیئے جاتے ہیں۔قرآن کریم کا یہ انداز نہیں۔اس کے متعلق یوں سمجھئے جیسے یہ تئیس سال کے عرصہ میں ارشاد فرمودہ مختلف خطبات کا مجموعہ ہو۔ اس میں ایک بات ایک مقام پر آتی ہے تو اس کی مزید وضاحت دوسرے مقام پر۔اضافہ کسی اور جگہ‘ استثناء کسی اور سورۃ میں۔نیز‘ مختلف حقائق کے متنوع گوشوں کو‘ مختلف موضوعات کے ضمن میں‘ لوٹا لوٹا کر سامنے لایا گیا ہے۔اس اندازِ بیان کو اس نے ’’تصریفِ آیات‘‘ سے تعبیر کیا ہے۔یعنی آیات کو پھیر پھیر کر سامنے لانا(6:106،17:41) اسی طریق سے اس نے اپنی اصطلاحات کا مفہوم بھی متعین اور واضح کیا ہے۔

(1) تصریفِ آیات:

قرآن کریم انسانی تصانیف کی طرح مختلف ابواب میں تقسیم نہیں ہے۔ بلکہ مختلف موضوعات کے بارے میں آیات پورے قرآن کریم میں مختلف مقامات پر موتیوں کی طرح خوبصورتی سے بکھری پڑی ہیں۔اگر کسی موضوع پر تحقیق مقصود ہو یا کسی لفظ‘ آیت یا اصطلاحِ قرآنی کا مفہوم معلوم و متعین کرنا ہو تو اس مقصد کے لئے ’’تصریفِ آیات‘‘(6:106،17:41) نہایت ضروری ہوگی۔ کیونکہ وضاحت (تفسیر وتشریح) یعنی تعینِ مفہوم کے معاملے میں یہ طریق کسی انسان کا وضع کردہ نہیں بلکہ یہ خود قرآن ہی کا بتایا ہوا فارمولا ہے۔اس فارمولے کے تحت‘ اگر مطلوبہ موضوع سے متعلقہ تمام آیاتِ قرآنی‘ یا جن جن قرآنی آیات میں کوئی لفظ یا اصطلاح استعمال ہوئی ہو‘ سب کو ایک جگہ جمع کر کے‘ بیک وقت سامنے رکھ کر غور کیا جائے اور قرآن کریم میں استعمال شدہ عربی زبان کے کسی لفظ کے متعدد معانی میں سے وہ معانی و مفہوم قبول کئے جائیں جو قرآن کریم کے کسی دوسرے مقام (پر استعمال شدہ کسی لفظ‘ اصطلاح یا آیت کے معانی و مفہوم) سے متصادم نہ ہوں تو مطلوبہ لفظ‘ اصطلاح یا آیت کے حقیقی مفہوم کا تعین خود قرآن کریم کردے گا۔اور وہ مفہوم اُبھر کر سامنے آجائے گا۔(اسی طرح انسانی زندگی میں سامنے آنے والے مختلف موضوعات یا مسائل پر غور وخوض کرنے اور اُن کا قرآنی حل تلاش کرنے کے لئے بھی ’’تصریفِ آیات‘‘ کے قرآنی فارمولے سے کام لینا ہوگا۔یوں قرآن کریم ہر دور میں انسان کی راہنمائی کرتا چلا جائے گا)۔

احتیاط:

اس فارمولے کے استعمال میں اس احتیاط کو خصوصاً ملحوظِ خاطر رکھنا ہوگا کہ آیات' الفاظ یا اصطلاحات کے متعین شدہ مفاہیم میں کوئی باہمی اختلاف' تضاد یا کجی نہ پائی جائے۔اور نہ ہی وہ مفاہیم منشائے قرآنی یا قرآن کریم کی مجموعی تعلیم سے متصادم ہوں۔اگر ایسا کوئی تضاد پایا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مطلوبہ مفہوم صحیح طور پر متعین نہیں ہو پایا۔کیونکہ ''قرآن کریم میں تو اختلاف' کجی اور تضاد کہیں ہے نہیں''(4:82،39:28)اس طریق پر عمل کرنے سے قرآن کریم کا صحیح مفہوم متعین کیا جاسکتا ہے۔

(2)مسئلۂ زبان:

قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے غیر عرب لوگوں کے سامنے زبان کا مسئلہ ہے۔ضروری ہے کہ عربی زبان سیکھی جائے کیونکہ کسی بھی کتاب کو صحیح معنوں میں سمجھنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے اس کتاب کی زبان سے واقفیت ضروری ہے۔اور عربی زبان ایک آسان زبان ہے۔پرویز صاحب ''مفہوم القرآن'' کے تعارف میں لکھتے ہیں۔''عربی زبان کی مستند کتبِ لغت و تفاسیر کی مدد سے' قرآن کریم کے تمام الفاظ کے معانی' پوری وسعت اور جامعیت کے ساتھ متعین کئے جائیں اور اس کے لئے جہاں تک پیچھے جاسکتے ہوں' جائیں۔تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ نزول قرآن یا اس سے قریب تر زمانہ میں ان الفاظ سے' بالعموم کیا مفہوم لیا جاتا تھا۔

(3)''پھر یہ دیکھا جائے کہ قرآن کریم نے ان الفاظ کو کن کن معانی میں استعمال کیا ہے۔اس کا انداز یہ ہے کہ وہ ایک بات کو مختلف مقامات پر بیان کرتا ہے' اور ان تمام مقامات کو بیک وقت سامنے لانے سے ان الفاظ کا مفہوم نمایاں طور پر سامنے آجاتا ہے۔

(4)اصطلاحات:

اصطلاحاتِ قرآنی کا مفہوم بھی قرآن کریم ہی سے متعین کیا جائے اور دیکھا جائے کہ وہ ان جامع اصطلاحات سے اپنی تعلیم کے کس قسم کے تصورات (Concepts) پیش کرتا ہے۔پرویز صاحب اصطلاحات کے بارے میں ''مفہوم القرآن'' کے تعارف میں رقمطراز ہیں۔''کوئی فن یا موضوع ہو' اس میں اصطلاحات کی حیثیت بنیادی اور کلیدی ہوتی ہے۔اور جب تک ان اصطلاحات کا صحیح تصور سامنے نہ آئے' متعلقہ موضوع یا فن سمجھ میں نہیں آسکتا۔اصطلاحات کے الفاظ تو اسی زبان کے ہوتے ہیں جس میں باقی کتاب لکھی گئی ہو' لیکن ان کا مفہوم بڑا جامع اور مخصوص ہوتا ہے۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو الفاظ' اصطلاحات کے لئے استعمال کئے جائیں اُن کے معانی کا اصطلاحات کے معانی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا' ایسا نہیں ہے۔اصطلاحات کے معانی کی بنیاد' اُن الفاظ کے معانی ہی پر رکھی جاتی ہے' البتہ ان کے مفہوم میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔قرآن کریم نے بھی اپنی اصطلاحات اسی طرح وضع کی ہیں اور ان کے معانی کی خود ہی وضاحت کر دی ہے۔اِن معانی کے سمجھنے کا طریق یہ ہے کہ پہلے ان الفاظ کے بنیادی معانی کو سمجھا جائے جن سے وہ اصطلاحات وضع کی گئی ہیں۔اس کے بعد' قرآن کریم کے ان تمام مقامات کو سامنے لایا جائے جن میں وہ اصطلاحات آئی ہیں۔ایسا کرنے سے ان کے معانی واضح طور پر سامنے آجائیں گے۔میں نے ''لغات القرآن'' میں ان اصطلاحات کے معانی اسی طرح متعین اور بیان کئے ہیں۔اور

وہی معانی اب ''مفہوم القرآن'' میں پیش کئے گئے ہیں۔ مثلاً:

صلوٰۃ:

قرآن کریم کی ایک خاص اصطلاح ''اقامتِ صلوٰۃ'' ہے' جس کے عام معنی نماز قائم کرنا یا نماز پڑھنا کئے جاتے ہیں۔ لفظ ''صلوٰۃ'' کا مادہ (ص۔ل۔و) ہے' جس کے بنیادی معنی کسی کے پیچھے پیچھے چلنے کے ہیں۔ اس لئے ''صلوٰۃ'' میں قوانینِ خداوندی کے اتباع کا مفہوم شامل ہوگا۔ بنا بریں' اقامتِ صلوٰۃ سے مفہوم ہوگا ایسے نظام یا معاشرہ کا قیام جس میں قوانینِ خداوندی کا اتباع کیا جائے۔ یہ اس اصطلاح کا وسیع اور جامع مفہوم ہے۔ نماز کے اجتماعات میں' قوانینِ خداوندی کے اتباع کا تصور محسوس اور سمٹی ہوئی شکل میں سامنے آجاتا ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے اس اصطلاح کو ان اجتماعات کے لئے بھی استعمال کیا ہے۔ قرآنی آیات پر تھوڑا سا تدبّر کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ کس مقام پر' اقامتِ صلوٰۃ' سے مراد اجتماعاتِ نماز ہیں اور کس مقام پر'' قرآنی نظام یا معاشرہ کا قیام''۔ ''مفہوم القرآن'' میں یہ معانی اپنے اپنے مقام پر واضح کر دیئے گئے ہیں۔

زکوٰۃ:

اسی طرح' مثلاً زکوٰۃ کی اصطلاح ہے۔ اس لفظ کا مادہ (ز۔ک۔و) ہے۔ جس کے بنیادی معنی' بڑھنا' پھولنا' پھلنا' نشوونما پانا ہیں۔ قرآن کریم نے اسلامی نظام یا مملکت کا فریضہ ایتائے زکوٰۃ بتایا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ نظام قائم اس لئے کیا جاتا ہے کہ نوعِ انسان کو سامانِ نشوونما فراہم کیا جائے۔ زکوٰۃ کا مروّجہ مفہوم یہ ہے کہ اپنی دولت میں سے ایک خاص شرح کے مطابق روپیہ نکال کر خیرات کے کاموں میں صرف کیا جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس میں بھی زکوٰۃ کے قرآنی مفہوم کی ایک جھلک پائی جاتی ہے۔ لیکن قرآن کریم نے اسے' ان خاص معانی میں استعمال نہیں کیا۔ اس لئے اس اصطلاح کو انہی معانی کے لئے مخصوص کر دینا قرآنی مفہوم کی وسعت اور ہمہ گیری کو مقیّد کر دینا ہوگا۔

دیگر اصطلاحات:

یہی صورت قرآن کریم کی دیگر اصطلاحات کی ہے۔۔۔ مثلاً کتاب' حکمت' ملائکہ' دین' دُنیا' آخرت' قیامت' ساعت' جنت' جہنم' ایمان' کفر' نفاق' فسق' اثم' عدوان' تقویٰ' عبادت' وغیرہ۔ مروّجہ تراجم میں ان اصطلاحات کے صرف وہی معنی دیئے گئے ہیں جو ہمارے ہاں متداول ہیں۔ لیکن ''مفہوم القرآن'' میں ان کے وہ وسیع اور ہمہ گیر معانی دیئے گئے ہیں جو مذکورہ بالا طریق سے متعین کئے گئے ہیں۔ ان مقامات پر غور کرنے سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے گی کہ ان اصطلاحات کے مروّجہ مقیّد مفہوم سے قرآنی تعلیم کس طرح سمٹ جاتی ہے' اور ان کے قرآنی مفہوم سے اس کی وسعتیں کس طرح حدود فراموش ہو جاتی ہیں۔ ایک ایسی کتاب کو' جو زمان و مکان کے حدود سے ماوراء' اور تمام نوعِ انسان کیلئے' ہمیشہ کے لئے ضابطۂ ہدایت ہو' ہونا بھی ایسا ہی چاہیے۔''

متشابہات:

مفہوم القرآن کے تعارف میں پرویز صاحب متشابہات کے بارے میں وضاحت کرتے ہیں۔ ''اسی سلسلہ میں ایک اور اہم نکتہ کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے۔ قرآن کریم میں جو کچھ خارجی کائنات یا انسانی دنیا (انفس و آفاق) کے متعلق کہا گیا ہے

یا جن امور کو تشبیہات اور تمثیلات کے انداز میں بیان کیا گیا ہے' ان کا مفہوم انسانی علم کی وسعت کے ساتھ زیادہ نکھر کر سامنے آتا جائے گا۔ ان مقامات کو' ہر زمانے کے انسان' اپنے زمانے کی علمی سطح کے مطابق سمجھ سکتے ہیں۔ لہٰذا' ان مقامات میں' قرآنی فہم ہر دور میں بدلتا (اور انسانی علم کی بلندی کے ساتھ بلند ہوتا) جائے گا۔ جو شخص ان مقامات کو آج سمجھنا چاہتا ہے اُس کے سامنے انسانی علم کی موجودہ سطح کا ہونا ضروری ہے۔ پھر بھی' اسے یہ کہنے کا حق نہیں پہنچتا کہ جو کچھ اس نے سمجھا ہے وہ اس باب میں حرفِ آخر ہے۔ حرف آخر کا حق تو' آخری انسان کے لئے ہی چھوڑنا ہوگا۔ اور وہ بھی ان میں سے بعض امور کی کنہ وحقیقت کے متعلق اتنا ہی سمجھ سکے گا جتنا شعور کی موجودہ سطح پر' انسان کے لئے سمجھنا ممکن ہے۔ اس کی تفصیل ''لغات القرآن'' میں ملے گی۔''

☆......☆......☆

مروّجہ مفہوم سے اختلاف:

''یہی وہ مقامات ہیں جہاں اعتراض کیا جاتا ہے کہ میں نے قرآن کریم کو بالکل نئے معنی پہنا دیئے ہیں۔ بعض حضرات تو جوشِ مخالفت میں یہاں تک آگے بڑھ جاتے ہیں کہ اسے ''دین میں تحریف'' قرار دے دیتے ہیں۔ اور اس کے لئے دلیل یہ دیتے ہیں کہ میں نے ان مقامات میں مروّجہ مفہوم سے اختلاف کیا ہے۔ جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے' یہ مروّجہ مفہوم سے اختلاف نہیں' بلکہ مروّجہ مفہوم کی محدودیت کو قرآن کی وسعت سے ہمکنار کر دینا ہے۔ ان مقامات میں دیکھنا یہ چاہیئے کہ جو مفہوم میں نے پیش کیا ہے' وہ ان الفاظ کے بنیادی معانی اور قرآن کریم کی کلی تعلیم کے خلاف تو نہیں۔ اس کے لئے ''لغات القرآن'' کے متعلقہ مقامات کا مطالعہ ضروری ہوگا۔ جہاں سے آپ کو میرے پیش کردہ مفہوم کی تشریح' دلیل اور سند مل سکے گی۔''

فہمِ قرآن کے لئے محترم پرویز کا موقف:

ماہنامہ طلوعِ اسلام، نومبر 2012، سرورق: ''ہماری مذہبی پیشوائیت نے محترم پرویز کی تصنیف ''لغات القرآن'' کے حوالے سے لوگوں میں یہ تاثر پھیلایا ہے کہ جو معانی اس لغت میں دیئے گئے ہیں وہ قرآن کریم کے ان تراجم سے مختلف ہیں جو ہمارے ہاں عام طور پر مروج ہیں۔ اس بناء پر' ان کا موقف جانے بغیر' ان پر کفر کا فتویٰ صادر کر دیا گیا۔ اور ان کے پیغام کو لوگوں تک پہنچنے سے روکنے کے لئے مذہبی نمائندے ابھی تک ہر جائز وناجائز حربہ آزمانے میں مصروف ہیں۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ فیصلہ کرنے سے پہلے محترم پرویز صاحب کے موقف کو بھی سامنے رکھا جائے جو انہوں نے خود زیرِ تبصرہ کتاب کے پیش لفظ میں یوں بیان کیا ہے:۔ ہم نے ہر لفظ کے لغوی معانی کی سند میں اُس کتاب کا حوالہ دے دیا ہے جس سے وہ معانی لئے گئے ہیں۔ اور اربابِ علم کے نزدیک اس کی حیثیت مستند ہے۔ ان کتابوں میں البتہ بعض اوقات ان کے موءلفین نے (لغوی معانی کے علاوہ) قرآنی تعلیم کے بارے میں خود اپنی رائے بھی دی ہے۔ ہم نے بعض مقامات پر (لغوی معانی سے نہیں) ان آراء سے اختلاف کیا ہے۔ محترم پرویز صاحب کا موقف اور علمی معیار بھی یہی ہے کہ اشخاص کی آراء (جن میں پرویز صاحب کی اختلافی آراء بھی شامل ہیں) ان کی ذاتی استعداد' رجحانات ومیلانات' نیز خود اس زمانے کی علمی سطح اور عام فضا کا نتیجہ ہوتی ہیں جس میں وہ تربیت پاتے ہیں۔ اس لئے دوسروں پر ان آراء کی پابندی لازم نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی یہ علمی

روشِ قرآن کی تعلیم سے مطابقت رکھتی ہے۔" ۔"لہٰذا' متقدمین سے اختلاف کرنے پر کسی کو موردِ عتاب ٹھہرانا بلا جواز ہے۔"

معانی متعین کرنے کا طریق:

"محترم پرویز صاحب نے لغات القرآن میں قرآن کریم کے معانی متعین کرنے کا یہ طریق اختیار کیا ہے:

(الف) سب سے پہلے متعلقہ لفظ کے مادہ کو دیکھا جائے کہ اس کا بنیادی مفہوم کیا ہے اور خصوصیت کیا؟۔ اس مادہ کی شکلیں کتنی ہی کیوں نہ بدلیں' اس کی خصوصیت کی روح بالعموم ہر پیکر میں جھلکتی رہے گی۔

(ب) اس کے بعد دیکھا جائے کہ صحرا نشین عربوں کے ہاں اس لفظ کا استعمال کس کس انداز سے ہوتا تھا۔ ان کے استعمال کی محسوس مثالوں سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ ان کے ہاں اس مادہ کا تصور (Concept) کیا تھا۔ واضح رہے کہ جب تک تصورات (Concepts) کا تعین نہ کیا جائے' الفاظ کا صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ یہ وہ بنیادی اصول ہے جس پر دورِ حاضرہ میں علم المعانی (Semantics) نے بڑی عمدہ روشنی ڈالی ہے۔ علم اللسان کے اس شعبہ کا مطالعہ' الفاظ کی روح تک پہنچنے میں بڑا ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔

(ج) اس کے بعد یہ دیکھنا چاہیئے کہ قرآن کریم میں وہ لفظ کس کس مقام پر آیا ہے اور اس نے اسے کس کس رنگ میں استعمال کیا ہے۔ ان مقامات سے اس لفظ کا قرآنی تصور (Quraanic Concept) سامنے آ جائے گا۔

(د) سب سے بڑی چیز یہ کہ قرآن کریم کی پوری تعلیم کا مجموعی تصور سامنے ہونا چاہیئے۔ اور اس بنیادی اصول کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ اس کے مفردات اور اصطلاحات کا مفہوم اس کی مجموعی تعلیم کے خلاف نہ جائے۔ اس لئے کہ قرآن کا دعویٰ ہے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ ذہن کو خارجی اثرات سے الگ رکھ کر قرآن کا مطالعہ خود قرآن کی روشنی میں کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو نور (روشنی) کہا ہے اور روشنی اپنے آپ کو دکھانے کے لئے خارجی مدد کی محتاج نہیں ہوتی۔"

اس طریق کی تائید میں پرویز صاحب نے درج ذیل دو مفکرین کی آراء کو بھی پیش کیا ہے:

(1) علامہ اقبال کا بیان کہ قرآنِ کریم کو عربی زبان اور تصریفِ آیات کی رو سے سمجھنا چاہیئے اور اس پر خارجی عناصر کو اثر انداز نہیں ہونے دینا چاہیئے۔

(2) شیخ محمد عبدہٗ کا تفسیر المنار کے مقدمہ میں قرآن کے صحیح معانی متعین کرنے کے بارے میں موقف کہ کسی لفظ کے خاص معنی کو ترجیح دینے کے لئے قانون کہ وہ معنی سابقہ عبارت سے مطابقت اور موافقت رکھتے ہوں۔ پورے موضوع و مطالب سے اتفاق رکھتے ہوں اور قرآن کے مجموعی مقصد سے ہم آہنگ ہوں۔" (ڈاکٹر انعام الحق)۔

مروّجہ عقائد و مسالک:

پرویز صاحب قرآن فہمی کو خود پر ختم نہیں سمجھتے۔ البتہ ان کا یہ کام پرانی روش اور عقائد و مسالک سے ہٹ کر ہے لہٰذا تنقید کا نشانہ۔ حالانکہ وہ کہتے ہیں۔ "اگر کسی کی دانست میں (میری تشریحاتِ قرآنی میں) کوئی مقام ایسا ہو جو عربی لغت یا قرآنی تعلیم کے خلاف جاتا ہے تو مجھے مطلع فرمائیں۔ میں ان کا شکر گزار ہوں گا اور ان کے اعتراض پر پوری توجہ دوں گا۔ لیکن

جو حضرات یہ کہیں کہ ماسمعنا بھٰذا فی آبائنا الاولین (23:24) یعنی ہم نے تو یہ بات اپنے آباؤ اجداد سے نہیں سُنی ۔تو وہ مجھے معذور سمجھیں۔'' پرویز صاحب کا قرآن فہمی کا فارمولا بڑا (scientific) ہے۔دیگر حضرات بھی اس فارمولے کے تحت یہی کوشش کر سکتے ہیں۔اور حقیقی مفہومِ قرآن تک پہنچ سکتے ہیں۔لیکن ایسا کرنے سے پہلے' اپنے دل و دماغ کو ذاتی تعصبات' جذبات' خیالات' رجحانات اور مروّجہ عقائد و مسالک سے پاک کرنا ہوگا۔کسی فرقہ یا مروّجہ مسلک سے وفاداری قرآن کے حقیقی مفہوم تک پہنچنے کے راستے میں رکاوٹ ثابت ہوتی ہے۔ہمارے مروّجہ عقائد اور مسالک میں بہت کچھ ایسا بھی ہے' جو قرآن کریم کے خلاف یا قرآن کریم سے خارج ہے۔چونکہ اصل مقصد قرآن کریم کے حقیقی مفہوم تک پہنچنا ہے لہٰذا اس میں خارج از قرآن کسی بات کو نہیں آنے دینا چاہیئے۔

یہ شرک ہے:

پرویز صاحب کے الفاظ میں: ''یہ بھی یاد رہے کہ میرے نزدیک یہ شرک ہے کہ انسان اپنے ذہن میں پہلے سے کوئی خیال لے کر قرآن کی طرف آئے اور پھر قرآن سے اس کی تائید تلاش کرنا شروع کر دے۔قرآن سے صحیح راہنمائی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان خالی الذہن ہو کر اس کی طرف آئے۔اور اس کے ہاں سے جو کچھ ملے اُسے من و عن قبول کرے۔خواہ یہ اس کے ذاتی خیالات' رجحانات' معتقدات اور معمولات کے کتنا ہی خلاف کیوں نہ ہو۔ہمارا مقصد ہے اپنے ایمان و عمل کو قرآن کے مطابق بنانا نہ کہ (معاذ اللہ) قرآن کو اپنے ایمان و عمل میں ڈھالنا۔میں نے قرآن کریم سے اسی انداز میں رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔یہ ہو سکتا ہے کہ اس سلسلے میں میرے فہم نے کہیں غلطی کی ہو۔لیکن میں نے قرآنی تعلیم کو اپنے کسی خیال یا رجحان کے تابع رکھنے کی جسارت کبھی نہیں کی۔اللہ اس سے محفوظ رکھے۔'' (مفہوم القرآن)۔

ایک انسانی کوشش:

پرویز صاحب اپنی ہر تصنیف (خصوصاً' تعارف یا دیباچہء کتاب کے آخر) میں یہ بات خصوصی طور پر' زور دے کر کہتے ہیں کہ ان کی تفسیر و تشریحِ قرآن کو حرفِ آخر نہ سمجھا جائے۔وہ ''مفہوم القرآن'' میں لکھتے ہیں۔''اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں غور و تدبّر کرنے کا حکم ہر دور کے انسانوں کو دیا ہے۔لہٰذا کسی ایک دور کے کسی ایک انسان کے تدبّر کو حرفِ آخر نہیں کہا جا سکتا۔حرفِ آخر کا حق تو آخری انسان ہی کے لئے چھوڑنا ہوگا۔میری کوشش فہمِ قرآن کی انسانی کوشش ہے۔اور انسانی کوشش کبھی سہو و خطا سے منزہ نہیں ہو سکتی۔نہ ہی اسے حرفِ آخر کہا جا سکتا ہے۔میں نے قرآن فہمی کے سلسلے میں اپنی بصیرت کے مطابق ایک نئی طرح ڈالی ہے۔اگر میری یہ کوشش نتیجہ خیز ہوئی تو مجھ سے بہتر صلاحیتیں رکھنے والے اسے واضح سے واضح تر کرتے چلے جائیں گے۔اور یوں یہ سلسلہ قانونِ کائنات کے مطابق اپنی ارتقائی منازل طے کرتا ہوا بڑھتا چلا جائے گا۔قرآن فہمی کا یہ سلسلہ نہ کسی دور میں ختم ہو سکتا ہے نہ کسی انسان تک پہنچ کر رُک سکتا ہے۔یہ ایک جوئے رواں ہے جو لا متناہی وسعتوں کا امکان رکھتی ہے۔جوں جوں انسانی علم وسیع ہوگا قرآنی حقائق بیش از بیش بے نقاب ہوتے جائیں گے۔یہ سلسلہ یوں ہی رہے گا حتیٰ مطلع الفجر۔''

البتہ ''اگر میری ان کوششوں سے چند نفوس بھی ایسے پیدا ہو گئے جن کے دل میں قرآن کی راہنمائی کا یقین علیٰ وجہِ

البصیرت اُبھر آیا'، تو میں سمجھوں گا کہ مجھے میری دیدہ ریزیوں اور جگر سوزیوں کا صلہ مل گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن سے میرا عشق مجھے مجبور کرتا ہے کہ ایک ایک کا ہاتھ پکڑوں اور اس سے التجا کروں کہ جو کچھ میں نے دیکھا ہے تم بھی ایک نظر دیکھ لو:

محبت چوں تمام افتد' رقابت از میاں خیزد بطوفِ شعلۂ پروانہ با پروانہ می سازد

اور چونکہ میرا یہ عشق خالی جذبات پر مبنی نہیں' بصیرت پر مبنی ہے۔ اس لئے میری اپیل بھی محض عقیدت سے نہیں' بصیرت ہی سے ہے۔ میں بچشمِ خود دیکھ چکا ہوں کہ انسانی زندگی کے مسائل کا حل قرآن کے علاوہ اور کہیں سے نہیں مل سکتا۔ اس یقین کا عام کرنا میری زندگی کا مقصد ہے۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔'' قرآن کریم کو سمجھنے کی اپنی اس کوشش کے بارے میں تقریباً ہر کتاب کے دیباچہ کے آخر میں لکھتے ہیں۔ ''اس میں جو کچھ صحیح ہے وہ صدقہ ہے خدا کی اس کتابِ عظیم کا جس میں حق و صداقت کے سوا کچھ نہیں اور جو سہو ہے وہ نتیجہ ہے میری کوتاہیٔ فہم کا۔

میرے ساقی نے عطا کی ہے مئے بے دُرد و صاف
رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے کا ہے

اس سہو وخطا کے لئے میں' اس درخواست کے ساتھ' بحضور رب العزت خواستگارِ عفو ہوں کہ:

گر دلم آئینہء بے جوہر است ور بحرفم غیر قِرآں مضمر است
پردہء ناموس فِکرم چاک کُن ایں خیاباں را زِ خارم پاک کُن

(اگر میرا دل ایک ایسا آئینہ ہے جس میں کوئی آب وتاب اور خوبی نہیں' اور میرے الفاظ میں قرآن کے علاوہ کچھ اور پوشیدہ ہے' تو میری سوچ اور فکر کے تقدُس اور وقار کے پردے کو چاک کردے' اور اس گلشن (قرآن) کو (میری کوتاہیٔ فہم کے) کانٹوں سے پاک صاف کردے)۔ اس کے برعکس:

گردُرِ اسرارِ قرآں سُفتہ ام با مسلماناں اگر حق گفتہ ام
در عمل پائندہ تر گرداں مرا آبِ نیسانم' گہر گرداں مرا

(اگر میں نے قرآن کریم کے اسرار ورموز (معانی) کے موتیوں کو پرونے کا کام کیا ہے' اور میں نے مسلمانوں کو حق بات بتائی ہے' تو مجھے میرے عمل میں مزید استقامت عطا فرما' اور میرے موسمِ بہار کی بارش کے قطروں کو موتی بنا دے۔ آمین!'' (تبویب القرآن۔ مراحلِ طلب وتجسُس)۔

(نوٹ) قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے پرویز صاحب کی کتب:۔ لغات القرآن (خصوصاً پیش لفظ)۔ تبویب القرآن، مفہوم القرآن اور سلسلۂ معارف قرآن (من ویزداں، ابلیس وآدم، جوئے نور، برقِ طور، شعلۂ مستور، جہانِ فردا، معراجِ انسانیت یعنی صاحب قرآن علیہ الصلواۃ والسلام کی سیرتِ طیبہ خود قرآن کی روشنی میں وغیرہ) اور تفسیر قرآن کریم بعنوان ''مطالب الفرقان'' کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ قرآن کریم کو واحد مکمل' غیر متبدل' جامع' غیر محرف اور آخری محفوظ وحی ثابت کرنے کے لئے پرویز صاحب نے ''مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں'' لکھ کر بھی ایک عظیم کارنامہ سرانجام دیا ہے۔

محمد حنیف' سیالکوٹ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کیا موجودہ پاکستان تعبیرِ خوابِ علامہ اقبالؒ ہے؟

جب بھی کبھی آزادیٔ پاکستان کے حوالے سے تقریبات ہوتی ہیں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ''پاکستان تعبیر خواب اقبالؒ ہے''۔ پاکستان کو معرض وجود میں آئے تقریبا 78 سال ہو گئے ہیں اور علامہ اقبالؒ 1938ء میں اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ ان کی وفات کے بعد علامہ اقبالؒ کے ساتھی قائداعظمؒ کی قیادت میں آگے بڑھے اور برصغیر کے مسلمانوں کی آزاد ریاست کے قیام میں کامیاب ہوئے۔

علامہ اقبالؒ کا خواب کیا تھا؟

سب سے پہلے ہم نے یہ تعین کرنا ہے کہ علامہ اقبالؒ کا خواب کیا تھا۔ ان کے تخیل کا پاکستان کیسا تھا۔ آزاد مسلم سٹیٹ کا تصور تھا' ایک امتِ واحد کا پاکستان' خلافت راشدہ والا پاکستان یا نبی آخر زماں ﷺ کے عہد والا پاکستان۔ علامہ اقبالؒ نے خطبہ الہ آباد میں وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہمارے تک اسلام ملوکیت کے دور میں آیا۔ اس کے اوپر ملوکیت کی چھاپ ہے یعنی اصل اسلام نہیں۔ دور خلافت راشدہ والا اسلام نہیں۔ جو رسول اکرم ﷺ اور ان کے ساتھیوں کے ذریعے متمکن ہوا۔ جب دور خلافت راشدہ ختم ہوا اور دور ملوکیت کا آغاز ہوا تو اسلام کی بنیادی ہیئت کو بڑے فن کارانہ انداز میں بدلا گیا۔ قرآن پاک کے الفاظ تو وہی رہے اس کے معنی بدل دیئے گئے۔ علامہ اقبالؒ نے واشگاف الفاظ میں کہا تھا کہ ہمارے پاس جو اسلام ہے اس کے اوپر غیر اسلامی تہیں چڑھ گئی ہیں۔ ان کو کھرچ کھرچ کر اتارنا ہوگا تاکہ اندر سے صحیح اسلام نکل آئے۔ انہوں نے فرمایا کہ!

یہ امت روایات میں کھو گئی
حقیقت خرافات میں کھو گئی

دراصل حقیقت تو قرآن ہی ہے جس پر ہمارا ایمان ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ہے۔ اس کو کوئی تبدیل نہیں کرسکتا۔ کیونکہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھی ہے۔ اس طرح قرآن کریم ہی ہمارا نظام حیات ہے۔ اس کے علاوہ ہمارا کوئی نظام حیات نہیں۔

کیا علامہ اقبالؒ جمہوریت کے حامی تھے؟

علامہ اقبالؒ مغربی جمہوریت کے ہرگز حامی نہیں تھے۔ انہوں نے جمہوریت کو تماشا کہا۔ مغربی جمہوریت دراصل سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام کو بچانے کا ذریعہ ہے اسلام جس کی شدت سے مخالفت کرتا ہے۔ اقبالؒ کا مقصد آزادی سے مراد مغربی جمہوریت ہرگز نہیں۔ وہ تو اس وقت یعنی اس دور میں موجود تھی۔ اس کا مقصد آزاد مسلم سٹیٹ تھا جس کا سارا نظام قرآن کریم کے احکامات کے

مطابق ہوگا۔ جس کے اندر عدل و انصاف ہوگا۔ کسی سے ناانصافی نہیں ہوگی۔ اسلامی معاشرہ میں نظام عدل قرآن کے احکامات کے مطابق ہوگا۔ کیونکہ عدلیہ ہر ایک کو اپنے مقام پر رکھ سکتی ہے اس کے برعکس آپ پاکستان کی کسی بھی عدالت میں چلے جائیں۔ لوگوں سے ملیں، کسی بھی سائل سے بات کریں جو حصول انصاف کے لئے عدالت میں آیا ہو۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ سب سے پہلے ایسا وکیل ڈھونڈے گا جس کے ججوں کے ساتھ تعلقات ہوں۔ جو اپنا موقف کسی نہ کسی ذریعے سے منوا سکے۔ اس کے باوجود بھی اس کو وکیل پر اعتماد نہیں ہوگا۔ پھر بھی وہ جج کا پتہ ڈھونڈے گا۔ اس کا کوئی رشتہ دار تلاش کرے گا۔ اگر جج کا رشتہ دار اس کو یقین دلوا بھی دے پھر بھی اس کو یقین نہیں ہوگا۔ پھر بھی وہ جج کے عملہ سے رابطہ کرے گا۔ کسی نہ کسی طریقہ سے اپنی حمایت کے لئے راضی کرے گا۔ اس کے باوجود بھی اس کا دل مطمئن نہ ہوگا۔ اس کے دل میں کھٹکا رہے گا۔ شاید میری مخالف پارٹی نے مجھ سے زیادہ ہمت کی ہو۔ جب سے پاکستان بنا ہے۔ عدلیہ کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔ ہمارے ملک کا نظام عدل تشویش ناک حد تک خراب ہو چکا ہے۔ ہر حکومت نے کبوتر کی طرح آنکھیں بند رکھیں کہ شاید بلی گزر جائے۔ لیکن بلی کہاں چھوڑتی ہے؟ کسی اعلیٰ عدالت کے جج نے کسی ماتحت عدالت کے جج کے فیصلوں کو چیک نہیں کیا کہ تم رشوت لے کر کون سے قانون کے مطابق انصاف کرتے رہے ہو۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ اکثر جج صاحبان نیچے سے اوپر تک گئے ہوتے ہیں۔ کبھی دیہاتوں میں مداری تماشہ کرنے آتے تھے۔ ان کے پاس پیتل کا بنا ہوا بیل ہوتا تھا۔ اس کے سینگ اوپر نیچے اور دائیں بائیں مڑ جاتے تھے۔ ایک شخص آ کر کہتا کہ ہمارا بیل چوری ہو گیا ہے۔ مداری پوچھتا اس کے سینگ کیسے تھے۔ بیل والا کہتا کہ اس کے سینگ ''تارے'' تھے (یعنی دونوں اوپر کو تھے) مداری ایک سینگ کو نیچے کر دیتا اور کہتا دیکھ لو یہ تمہارا بیل نہیں ہے پھر دوسرا شخص آتا اور کہتا کہ میرا بیل چوری ہو گیا ہے۔ آپ کے پاس ہے۔ مداری پوچھتا آپ کے بیل کے سینگ کیسے ہیں۔ بیل والا کہتا ایک سینگ نیچے کو اور دوسرا اوپر کو ہے۔ مداری دنوں سینگ اوپر کر دیتا۔ یہی حالت ہمارے قانون کی ہے۔ جس طرف چاہیں موڑ لیا جاتا ہے۔ میں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے کہ ہمارے ملک میں قانون کے متعلق کام نہیں ہوا۔ کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ عورت زنا اور قتل کی شہادت نہیں دے سکتی۔ کبھی عورت کی گواہی آدھی۔ کبھی ناقص العقل ہے۔ جو کچھ میں لکھ رہا ہوں یہ سب کچھ ہمارے سامنے ہوتا ہے۔ کیا یہی تعبیرِ خوابِ اقبالؒ ہے۔ جس نے کہا تھا ''آدمیت احترام آدمی است'' ''ہر انسان واجب احترام ہے'' (القرآن)۔ پاکستان علامہ اقبالؒ کے خواب کی تعبیر تو تب ہوتا جب پاکستان میں بسنے والوں کی یکساں عزت ہوتی۔ ذات، برادری، غریب، امیر ان چیزوں کا عمل دخل نہ ہوتا۔ لیکن افسوس ایسا نہ ہوا۔ جب تک ہمارے ملک میں عدل و انصاف میسر نہیں آتا خوابِ اقبالؒ شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ اب میں آتا ہوں دوسرے گوشے کی طرف جو ملک کے لئے انتہائی خطرناک ہے۔

فرقہ واریت

کیونکہ یہ ملک اسلام کے نام پر لیا گیا ہے۔ یہاں پر ایک قوم ہی بستی ہے۔ جو اللہ پر، کتابوں پر، ملائکہ پر، یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہے اور ایک ہی کلمہ پڑھتی ہے۔ مجھے

اچھی طرح یاد ہے کہ جب پاکستان نیا نیا بنا تھا۔ ہم لوگ ہندوستان سے پاکستان آئے تھے۔ کافی عرصہ تک فیصل آباد کے ایک گاؤں میں رہے۔ وہاں ایک ہی مسجد تھی۔ فقہ جعفریہ' حنفیہ' اہل حدیث' دیوبند اکٹھے ہی نماز پڑھتے تھے۔ نماز جمعہ' عیدیں اکٹھے ہی پڑھتے تھے۔ یوں وقت گزرتا گیا۔ فرقہ واریت کی خلیج بڑھتی گئی۔ آہستہ آہستہ ایسا وقت آ گیا کہ ایک دوسرے کی عبادت گاہیں محفوظ نہیں ہیں۔ اندر عبادت کرنے والے محفوظ نہیں۔ پولیس کے پہرہ میں نمازیں ادا ہوتی ہیں۔ نمازی جان ہتھیلی پر رکھ کر مساجد میں جاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوا۔ اس کی وجوہات درج ذیل ہیں۔

فرقہ واریت پھیلانے میں وہ علماء شامل ہیں جو پاکستان بننے کے خلاف تھے۔ جونہی پاکستان بنا وہ پاکستان آ گئے۔ ان کو پاکستان کانٹے کی طرح چبھتا تھا۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح پاکستان ختم ہو جائے یا اس کی باگ دوڑ ہمارے ہاتھ میں آ جائے۔ ان کے علاوہ کچھ علماء یہاں پہلے ہی موجود تھے جو پاکستان بننے کے خلاف تھے۔ حالانکہ وہ عقیدہ کی بنا پر ایک دوسرے کے خلاف فتوے جاری کرتے تھے لیکن ایک مفاد ان کا اکٹھا تھا کہ کسی نہ کسی طرح پاکستان ختم ہو جائے۔ مثال کے طور پر مودودی مرحوم اور مفتی محمود مرحوم ایک دوسرے کے سخت خلاف تھے۔ ایک دوسرے پر کفر کے فتوے جاری کئے لیکن جہاں ان کا مفاد مشترک ہوتا یعنی پاکستان کو کمزور کرنا ہوتا دونوں اکٹھے ہوتے۔ مثال کے طور پر ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف جو تحریک چلی ''تحریک نظام مصطفیٰ'' دونوں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ایک دوسرے کا ساتھ دیا۔ یہ تحریک صرف عوام کو دھوکہ تھا۔ بھٹو کو کرسی سے اتارنے کے لئے ایک سیاسی نعرہ تھا۔ جب ان کا مقصد پورا ہو گیا تو تحریک کا نام ونشان باقی نہ رہا۔ حالانکہ انہوں نے عوام کے جذبات کو اس حد تک ابھارا کہ انہوں نے اپنے سینے گولیوں کے آگے کر دیئے۔ سینکڑوں لوگوں نے اپنی جانیں دیں۔۔۔ معاملہ ضیاء الحق کے مارشل لاء تک آیا۔ فوج نے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ مولانا مودودی نے کہا کہ ضیاء حکومت کی حمایت کرنا عین اسلام ہے۔ جب کہ 1958ء کو ایوب خاں نے مارشل لاء لگایا تو مودودی صاحب نے اس کی مخالفت کی تھی اور فرمایا تھا کہ ان کی مخالفت کرنا عین اسلام ہے کیونکہ اس نے طاقت کے بل بوتے پر حکومت پر قبضہ کیا ہے۔ حالانکہ ضیاء الحق اور ایوب دونوں ہی فوجی تھے۔ دونوں نے طاقت کے بل بوتے پر حکومتوں پر قبضے جمائے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ضیاء الحق نے جماعت اسلامی کو حکومت میں نمائندگی دی۔ جب تحریک نظام مصطفیٰؐ چل رہی تھی۔ چوہدری ظہور الٰہی نے اپنی رہائش گاہ پر افطار پارٹی کا اہتمام کیا۔ جس میں مفتی محمود صاحب اور شاہ احمد نورانی صاحب بھی شامل تھے۔ دونوں نے ایک ہی جگہ روزہ افطار کیا۔ لیکن ان دونوں نے ایک ہی گراؤنڈ میں علیحدہ علیحدہ جماعت کرائی۔ یہ ہیں ہمارے بڑے بڑے دینی رہنماؤں کی قلبی وسعتیں اور کردار۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایسے کردار پاکستان میں اسلامی انقلاب برپا کر سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ یہ لوگ تو دنیا سے تشریف لے گئے ہیں۔ ان کے پیش رو ان سے دو قدم آگے ہیں اپنے بزرگوں کے مشن کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر مفتی محمود صاحب کے پسر ارجمند جناب مولانا فضل الرحمن

صاحب نے اخبارات میں بیان فرمایا کہ میرا باپ پاکستان بنانے کے جرم میں شامل نہیں تھا۔ ایسا ہی بیان مودودی صاحب کے لخت جگر فاروق مودودی صاحب نے دیا۔ ان کی نظروں میں جو لوگ بھی تحریک پاکستان میں شامل تھے سب لوگ مجرم تھے۔ یہ شاباش کے مستحق ہیں۔ یہ تو حالات ہیں بڑے بڑے صاحبان اور ان کے صاحبزادگان کے۔ میرے عرض کرنے کا مطلب و مدعا یہ ہے کہ دنیا بھر میں خاص کر پاکستان میں اسلام کے نام پر سادہ لوح لوگوں کا جو استحصال ہوا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ پاکستان میں ایسے ہونے کا دکھ اس لئے ہے کہ یہ واحد اسلامی ملک ہے جو خالصتاً اسلام کے نام پر لیا گیا ہے۔ اسلام میں فرقہ واریت ممنوع ہے۔ ''اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رکھنا' آپس میں فرقہ فرقہ نہ ہوجانا''۔ (القرآن) اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی روشنی میں اپنے آپ کو پرکھیں کہ ہم فرقہ بندی کے مرض میں مبتلا تو نہیں' اگر جواب ہاں میں ہے تو جس جس نے فرقہ بندی اختیار کی اس کا اللہ اور اس کے رسولؐ کے خلاف اعلان جنگ ہے۔

مندرجہ بالا احکامات کی روشنی میں اپنے آپ کو پرکھیں۔ کیا ایسا ہے' اگر ایسا ہے تو کیا ہم اس پاکستان کو اقبالؒ کا خواب کہہ سکتے ہیں۔ یہاں پر تو اپنی سیاست چمکانے کے لئے فرقہ واریت کو ہوا دی گئی ہے۔ امت مسلمہ کو کئی حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

ہمارے دینی علمائے کرام نے بجائے اس کے کہ امت مسلمہ ایک ہوتی' ان لوگوں نے ہمیں ایک نہ رہنے دیا۔ آج ہماری حالت یہ ہے کہ غالب ہونے کی بجائے اس حد تک مغلوب ہیں کہ پوری دنیا میں مسلمانوں کی عزتیں محفوظ نہیں ہیں۔ عراق میں جنگی قیدیوں کے ساتھ کیا کیا گیا۔ ان کو ننگا کیا گیا' کتے بنایا گیا' اس کا سبب بھی ہمارے دینی رہنما ہیں۔ مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا۔ جب ایران اور عراق کی آپس میں جنگ ہو رہی تھی سب عرب ملک عراق کے ساتھ تھے۔ مصر نے تو فوجی مدد بھی کی۔ بغداد میں صدام حسین نے علماء کی ایک کانفرنس بلوائی' اس میں بڑے بڑے علماء نے شرکت کی۔ پاکستان سے علامہ احسان الٰہی ظہیر شریک ہوئے۔ وہ واحد عالم تھے جنہوں نے فی البدیہہ تقریر عربی میں کی۔ اس نے ایران کو کیا کچھ نہ کہا' وہ جنگ دو مسلمان ملکوں کے درمیان تھی۔ جس کو بند کروانا چاہئے تھا نہ کہ کفر کے فتوے دیئے جاتے۔ یہ ہے ہمارے علماء کا کردار جس سے مسلمان ایک قوم نہ بن سکی میرے مختصر عرض کرنے کا مطلب و مدعا یہ ہے کہ دنیا بھر میں خاص کر پاکستان میں اسلام کے نام پر سادہ لوح لوگوں کا جو استحصال ہوا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ پاکستان میں ایسے واقعات رونما ہونے کا دکھ اس لئے ہے کہ یہ واحد ملک ہے جو خالصتاً اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے اسلام میں فرقہ واریت اور گروہ بندی ممنوع ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام

اسلام مساوات قائم کرنے والا دین یعنی سسٹم ہے ہم اس کو نظام حیات بھی کہتے ہیں۔ پاکستان میں کاروباری نظام دوسرے ممالک کے کاروباری نظام کے مقابلے میں فرسودہ اور ظالمانہ ہے۔ آپ دوسرے ممالک کے کارخانہ دار کو دیکھیں' اس نے مزدوروں کو بہت سہولتیں دے رکھی ہیں۔ ان کے مزدور کو رہائش کی فکر نہیں ہے۔ بچوں کی تعلیم کی فکر نہیں ہے۔ علاج معالجہ کی فکر نہیں ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہمارے مزدور پڑھ لکھ جائیں۔ ہمارے ملک کا سرمایہ داران

کو اَن پڑھ دیکھنا چاہتا ہے۔ اَن پڑھ معاشرہ کبھی ترقی نہیں کرسکتا۔ علامہ اقبالؒ کا یہ خواب نہیں تھا کہ دولت چند ہاتھوں میں چلی جائے۔ ہمارے زیادہ تر حکمران سرمایہ داری کو ہی تقویت دیتے ہیں۔ اپنے مفادات جبکہ نظریہ پاکستان ہمارے ملک کی اساس ہے' جس کا مطلب یہ ہے کہ ملک میں عام آدمی کا معیار زندگی بلند کرنا' عام آدمی کو بھی تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنا ہے لیکن ایسا ہرگز نہیں ہو رہا ہے۔

جاگیردارانہ نظام

پاکستان بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے۔ جس کی معیشت کا دارومدار زراعت پر ہے۔ علامہ اقبالؒ نے کہا تھا۔

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امراء کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

وہ کہنا یہ چاہتے تھے کہ ایک کسان بمعہ اپنے اہل و عیال کے سارا سال کھیتوں میں محنت کرتا ہے لیکن ایک جاگیردار زیادہ حصہ اپنے گھر لے جاتا ہے۔ بے چارے کسان کو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے کچھ نہیں بچتا۔ نہ تو اپنے بچوں کی بیماری کی صورت میں ان کا علاج کروا سکتا ہے اور نہ ہی ان کو تعلیم دلوا سکتا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب نیا نیا پاکستان بنا تو جو لوگ کھیتی باڑی کرتے تھے ان کو افراد کے حساب سے زمین دی گئی۔ مثلاً فی کس فی ایکڑ اور جہاں زمین کی پیداوار تھوڑی تھی یا زمین بارانی تھی۔ فی ایکڑ زیادہ دی گئی۔ پھر الاٹمنٹ کا سلسلہ شروع ہوا۔ محکمہ Settlement اراضی قائم ہوا۔ کھیتی باڑی کرنے والے افراد کن کن مصائب کا شکار ہوئے۔ پھر زرعی انقلاب کا دور دورہ آیا۔ یعنی دستی یا بیلوں سے کھیتی باڑی کی جگہ ٹریکٹروں اور مشینوں نے لے لی۔ مشینوں سے قبل جاگیردار کچھ مجبور تھا اور محتاج تھا۔ ساری زمینوں کو کاشت کرنے کے لئے اسے کسانوں کی ضرورت پڑتی تھی۔ جب مشینوں کا دور آیا۔ جن لوگوں کا دارومدار کھیتی باڑی پر تھا ان کو بے دخل کر دیا گیا۔ ٹریکٹر خریدے گئے اور ٹیوب ویل نصب کئے گئے۔ ٹریکٹر اور ٹیوب ویل سے قبل جس کے پاس بیلوں کی جوڑی ہوتی تھی سارا گھر مصروف ہوتا تھا۔ بیوی ہاتھ بٹاتی' بچے ہاتھ بٹاتے۔ اس طرح مشینوں نے ملک کی آدھی آبادی کو بے روزگار کر دیا۔ ماہرین منصوبہ سازوں اور پالیسی سازوں نے ان لوگوں کو بری طرح نظرانداز کیا جس سے ملک میں پیسہ' دولت چند ہاتھوں میں چلا گیا۔ جو غربت اور افلاس کا موجب ہوا۔ علامہ اقبالؒ کا مقصد ایسا پاکستان نہیں تھا جس میں مسلمان فرقہ واریت کا شکار ہوں۔ ایک دوسرے کی عبادت گاہیں بھی محفوظ نہ ہوں۔ علامہ اقبالؒ کا مقصد ایسا پاکستان بھی نہیں تھا جس میں سرمایہ کے نام پر قارونیت فروغ پائے۔ علامہ اقبالؒ کا مقصد ایسا پاکستان بھی ہرگز نہیں تھا جس میں زمین کو اللہ کی ملکیت میں ہونا تھا تاکہ کسان کی دسترس میں ہو جبکہ اس پر جاگیردار قبضہ کر لیں۔ میں سوجھ بوجھ رکھنے والے باشعور پاکستانیوں اور دانشوروں سے اپیل کرتا ہوں کہ ابھی سنبھلنے کو وقت ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کی قیادت میں عظیم قربانیوں کے بعد ایک قطعہ زمین حاصل کیا تھا اس کو علامہ اقبالؒ کے خواب کی تعبیر بنایا جائے جو عظیم مقاصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔

مذہب	دین
8- مذہب کشمکش حیات سے فرار سکھا تا ہے۔	دین زندگی کے حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے۔
9- مذہب تقدیر کے بہانے انسان کو بے عمل بنا دیتا ہے۔	دین، اسے تقدیر شکن قوت عطا کر کے، حرکت و عمل کا شعلۂ جوالہ بنا دیتا ہے۔
10- مذہب خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات کا نام عبادت رکھ کر انسانوں کو خود فریبی میں مبتلا رکھتا ہے۔	دین، اسے وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل کا پیغام دیتا اور نظامِ خداوندی کو دنیا کے ہر نظامِ باطل پر غالب کرنے کو عبادت کی غایت بتاتا ہے۔
11- مذہب، کائنات کی ہر حسین شے پر منہ بسورنا اور نعمائے خداوندی سے اجتناب سکھاتا ہے۔	دین اعلان کرتا ہے کہ وہ کون ہے جو زیب و زینت کی ان چیزوں کو حرام قرار دے سکتا ہے، جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے (القرآن)۔
12- مذہب ہر جدت (نئی چیز) کو گناہ قرار دینے تک لے جاتا ہے۔	دین کہتا ہے کہ کل یوم ھو فی شان۔ زندگی کے تقاضے ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں اس لئے جدت طرازی عین تقاضائے حیات ہے۔
13- مذہب اپنے پیغام کے حق کی دلیل میں اسے اسلاف کا مسلک قرار دے کر بطور سند پیش کرتا ہے۔ ان کی طرف سے پیش کردہ عقائد پر ایمان بلا علم و دلیل لانے پر زور دیا جاتا ہے۔	دین انسان کی علمی اور عقلی صلاحیتوں کو جلا دینے کا موجب اور اسلاف کے مسالک کی بلا دلیل پیروی سے منع کرتا ہے۔ وہ اپنے ہر دعویٰ کو دلیل اور برہان سے پیش کرتا ہے اور عقل و تدبر سے کام لینے کی تاکید بھی۔
14- مذہب کا تصور مفاد پرست انسانوں کے ذہن کا تراشیدہ ہے۔ ان میں سبھی ملوکیت (فرعون)، سرمایہ داری (قارون) اور مذہبی پیشوائیت (ہامان) کے نمائندے باہمی اشتراک سے دوسروں کی محنت سے کمائی پر عیش کی زندگی بسر کرنے کے لئے ہر جائز و ناجائز حیلے تراش کر مذہب میں شامل کر لیتے ہیں۔ خود مترفین بن کر دوسروں کو محکوم بنا لیتے ہیں۔	دین مذہب کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسانوں کو آزادی کی دعوت دیتا ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان کو اپنا محکوم اور اطاعت گذار بنائے۔ اطاعت صرف خدا (اس کے قوانین) کی کی جا سکتی ہے اور یہ قانون سب کے لئے برابر ہونے کی وجہ سے تمام نوعِ انسانی کے لئے مساوات کا پیغام رکھتا ہے۔
15- مذہب اس راستے کو کہتے ہیں جو انسانوں کا وضع کردہ ہو۔	دین اس قانون یا نظام کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملا ہو۔

اس لئے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآن نے نوعِ انسانی کی ہدایت کے لئے دین ہی کو پیش کیا ہے اور اسے ہی اسلام کا نام دیا ہے۔ لہٰذا مسلم مذہب کی نہیں دینِ اسلام کی اطاعت کرتا ہے۔

☆☆☆

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.78
ISSUE
06

Monthly TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546
E-mail:idarati@gmail.com Web: www.toluislam.org
www.facebook.com/idaratolueislam1/ www.youtube.com/idaratolueislam